قتلِ اولاد

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ خَشۡيَةَ اِمۡلَاقٍ‌ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ‌ؕ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا

ترجمہ: اورتم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل مت کرو، ہم ہی انہیں (بھی) روزی دیتے اور تمہیں بھی، بے شک ان کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔'' (بنی اسرائیل:۱۷:۳۱)

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ‌ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَاِيَّاهُمۡ

''اور مفلسی کے باعث اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم ہی تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی (دیں گے)'' (الانعام،۶:۱۵۱)

قَدۡ خَسِرَ الَّذِيۡنَ قَتَلُوۡۤا اَوۡلَادَهُمۡ سَفَهًۢا بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّحَرَّمُوۡا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افۡتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ‌ؕ قَدۡ ضَلُّوۡا وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ‏.

ترجمہ۔''بیوقوفی سے قتل کرڈالا اور (واقعی ایسے لوگ برباد ہوگئے جنہوں نے اپنی اولاد کو بغیر علم (صحیح) کے (محض ان (چیزوں) کو جو اللہ نے انہیں (روزی کے طور پر) بخشی تھیں اللہ پر بہتان باندھتے ہوئے حرام کر ڈالا، بے شک وہ گمراہ ہو گئے اور ہدایت یافتہ نہ ہو سکے۔(الانعام۔۶:۱۴۰)

ان حقیقتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن میں نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ معصوم زندگیاں ضائع ہوجاتی ہیں۔وجہ کیا ہے؟ شاید قوانین خداوندی سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

ایک نئی زندگی کا اس دنیا میں پہلی سانس سے آخری سانس تک کا سفر کس طرح رونما ہوتا ہے، وہ خالقِ کائنات کے علم میں ہے۔لیکن اس زندگی کو کس طرح یہاں خطرات سے بچنا یا بچانا ہے، اس کے لیے مفید اصول متعین کردیئے گئے ہیں۔اگر انگلی آگ میں ڈالو گے تو جل جائے گی، یہ نتیجہ تو فوراً برآمد ہوجاتا ہے۔اس طرح نئی زندگی کی شمع گل کرنے کے لیے جب کسی بھی مہربان سے رابطہ کریں گے تو اس کا نتیجہ ماں کی زندگی کی شمع گل کرنے پر منتج بھی ہوسکتا ہے۔

ہمارے اردگرد کئی ایسی کہانیاں ہیں کہ اسقاطِ حمل کے واقعات کے خطرناک مراحل سے گزرنے کے بعد ماں یا تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور پیچھے درد کی پرچھائیاں خاندان بھر کے لئے چھوڑ جاتی ہے، یا پھر ایک عرصہ تک تکلیف دہ بیماریوں سے نبرد آزما رہتی ہے۔

یہ ستم عورت پر مرد نے اس وقت ڈھایا، جب اس نے ایک ماں کو جو کہ اولاد کے لئے سکون اور تعلیم وتربیت کا مرکز ہوتی ہے، اس کے مقام سے گرا کر کسی بھی حیوان کی طرح آبادی بڑھانے والی مادہ قرار دیا۔

ہر سال گیارہ جولائی کو عالمی سطح پر آبادی کا دن منایا جاتا ہے۔ڈیڑھ سو سال پہلے انگلینڈ کے ماہر معاشیات مالتھس نے حساب لگایا کہ دنیا کی آبادی سالانہ دوگنا کے حساب سے بڑھتی ہے جب کہ وسائل کے بڑھنے کا تناسب بہت کم ہے۔لہٰذا اگر اسی رفتار سے آبادی بڑھتی رہی تو زمین تنگ ہو جائے گی۔اور معاش کے وسائل پورے نہ ہوسکیں گے۔اور اس طرح آبادی کے بڑھنے سے معیارِ زندگی پست ہوتا چلا جائے گا اس کا حل اس نے یہ پیش کیا کہ آبادی، وسائل کی وسعت کے ساتھ متناسب رہے اور اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کچھ تجاویز بھی پیش کیں۔مثلاً یہ کہ بڑی عمر میں شادی کی جائے[۱] اور ازدواجی زندگی میں اولاد کی خواہش سے احتراز کیا جائے وغیرہ۔ ان خیالات کا اظہار پہلی مرتبہ ۱۷۹۸ میں اس نے اپنے ایک مضمون میں کیا۔

[۱] An Essay on population and its effects on the future improvement of society.

ابتداء میں اہل مغرب نے اس نظریہ کو بالکل نظرانداز کر دیا۔لیکن 75 سالوں میں آبادی کے تناسب میں دوگنا اضافے کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں یہ تحریک نئے سرے سے اٹھی اور Neo Malthusian movement کہلائی۔اس تحریک کی کامیابی اور لوگوں کی آگاہی کے لئے باقاعدہ انجمنیں قائم کی گئیں جنھوں نے تحریر وتقریر کے ذریعے ضبط ولادت کے فوائد اور اس کے عملی طریقوں سے لوگوں کو آگاہ کیا۔اس کو اخلاقی نقطہ نظر سے جائز بلکہ احسن اور معاشی نقطہ نظر سے مفید بلکہ قطعاً ناگزیر بتایا۔اس کے لیے دوائیں ایجاد کیں،آلات بنائے گئے۔پھر عام لوگوں کی دسترس تک ان چیزوں کو پہنچانے کا انتظام کیا۔جگہ جگہ ضبط ولادت کے سنٹر قائم کیے گئے جہاں عورتوں اور مردوں کو ضبط ولادت کے ماہرانہ مشورے دیئے جانے لگے۔

ان محرکات میں انیسویں صدی کا صنعتی انقلاب شامل ہے۔ عورتوں کی معاشی جدوجہد اور جدید تہذیب وتمدن کا فروغ جس سے خاندانی نظام متاثر ہوا۔ نئے حکومتی قوانین بنائے گئے تاکہ عورت نظام خانہ داری سے باہر آکر آزادی کی زندگی گزارے۔بچوں کو گورنمنٹ کی طرف سے آزادی ورسرپرستی ہوکہ جب جوانی کی حدود میں داخل ہوں تو خاندانی بندھنوں سے آزاد ہوکرسوچیں،جن کو آزادی جنسیات تو حاصل ہوجائیں لیکن گھریلو ذمہ داریوں یعنی تولید و پرورش نسل سے بری الذمہ کر دیا جائے۔لہٰذا ارباب اقتدار،سیاسی اور معاشی ماہرین کی کاوشوں سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوگیا جس سے والدین اولاد کو اپنی خوشیوں اور ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھنے لگے۔یوں اس معاشرے سے انسانی اقدار کو رخصت کر کے ایک انسان نما حیوانی معاشرے کی داغ بیل ڈالی گئی۔

مانع حمل دواؤں کا استعمال بے دریغ ہونے لگا۔اسقاطِ حمل سے ماؤں کی شرح اموات میں اضافہ ہونے لگا۔جنسی بیماریوں اور بے راہ رویوں، دماغی بیماریوں میں اضافے کے باعث یہ انقلاب ڈیڑھ سو سال کی کاوشوں کے بعد بام عروج پر پہنچا۔

اب یہ صورتحال ہے کہ امریکہ انگلینڈ اور یورپی ممالک میں سکولوں کے بچوں کو یہ تربیت دی جارہی ہے کیونکہ وہاں بے راہ روی عام ہے۔بچوں کو اجازت ہوتی ہے کہ ضبط ولادت کا جو مرضی طریقہ استعمال کریں اور دوائیں وغیرہ مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

اس انقلاب کا اثر اسلامی ممالک نے کافی تردد کے بعد قبول کیا۔ لیکن قوانین کی رو سے اسقاطِ حمل ایک جرم قرار دیا جو کہ آج بھی نافذ العمل ہے۔

مانع حمل ادویات کا استعمال چند ناگزیر حالات کے تحت ماؤں کی شرح اموات کو کم کرنے کیلئے رائج کیا گیا اور اولاد میں وقفہ کیلئے تاکہ ماں اور بچے کی صحت بہتر ہو۔سماجی بہبود کی تنظیمیں ہیلتھ ورکرز کے ساتھ مل کر شہر شہر گاؤں گاؤں،محلّہ وگلی میں صحت سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔لیکن ہماری ناکامی ہر ماں کی موت کے ساتھ ہمارا منہ چڑا رہی ہے۔

یہ بات افسوسناک ہے کہ قتل جیسے گھناؤنے جرم میں ایک ماں ملوث ہوتی ہے۔

سروے 2003-2002 کی رپورٹ میں ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں سالانہ 890,000 حمل ضائع کروائے جاتے ہیں جس کا تناسب زندہ پیدائش کے مقابلے میں 0.207 ہے۔اس کا مطلب ہے چھ زچگیوں میں ایک کا خاتمہ اسقاط پر ہوتا ہے۔یعنی اوسطاً ہر عورت زندگی میں ایک بار اسقاط حمل سے گزرتی ہے۔ اندازاً 197,000 عورتیں اسقاط کی پیچیدگیوں کے ساتھ مختلف ہسپتالوں اور ہیلتھ سروسز میں زیرعلاج ہوتی ہیں۔ جب پاکستانی خواتین سے ایک سروے میں اسقاط حمل کی وجہ معلوم کی گئی 55% خواتین کا کہنا تھا کہ اور بچہ نہیں چاہیے تھا (یعنی بچوں کی تعداد ان کے خیال سے مکمل ہوگئی تھی)۔ 54 فیصد خواتین نے کہا کہ معاشی تنگی کے باعث مزید بچہ پیدا نہیں کر سکتیں (یعنی تین سے پانچ بچوں کے بعد)۔25 فیصد خواتین نے کہا کہ آخری بچہ بہت چھوٹا ہے۔ 22% خواتین نے کہا کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں۔

تفصیلی رپورٹ جو پاپولیشن کونسل اسلام آباد،Peter Miller اور

W.H.O سے دستیاب ہیں۔ ان میں ناجائز اور غیر قانونی اسقاطِ حمل کا اندازہ وشمار مشکل ہے۔ کیونکہ یہ چھوٹی جگہوں پر غیر محفوظ طریقوں سے کروائے جاتے ہیں جہاں جراثیم کش طریقوں سے آلات کو صاف نہیں کیا جاتا۔

پاکستان میں اسقاط حمل کی ممانعت کا قانون موجود ہے۔ آرٹیکل 312 کے تحت کوئی شخص جو غیر قانونی اسقاطِ حمل کرتا ہو اسے تین سال قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔ اگر عورت اپنے حمل کو ضائع کرنے کی کوشش کرے تو یہ سزا 7 سال تک بھی بڑھ سکتی ہے۔ بچے کے اعضاء نہ بنے ہوں تو اسقاط جرم ہے، ماسوائے ماں کی زندگی بچانے کیلئے۔ بچے کے اعضاء بننے کے بعد اسقاط حمل کیا جائے تو اس کی دیت بھی ہوگی جو ایک مکمل انسان کے مقابلے میں دسواں حصہ ہوگی۔ اگر بچہ زندہ پیدا ہو کر غفلت سے مر جائے تو دیت مکمل انسان کی ہوگی۔

ان تمام قوانین کے باوجود پاکستان میں اسقاط حمل کی شرح میں اضافہ ہوا ہے جس میں جائز اور ناجائز دونوں طرح کے کیسز شامل ہیں۔ فیملی پلاننگ کے چند ادارے بھی اسقاط حمل کروانے کی آفر کرتے ہیں۔

انسان کا ہر عمل نتیجہ پیدا کرتا ہے اگر بہتری کی طرف ہو گا تو خوشگواریاں زندگی میں شامل ہوں گی ورنہ زندگی کو جہنم میں تبدیل کرنے کیلئے اعمال بد ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ قانون خداوندی اسقاط حمل جو کہ جرم بھی ہے اور اخلاقی برائی بھی اور جس کو قرآن نے سختی سے منع فرمایا ہے، تو اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کس طرح سکھ کی زندگی پا سکتے ہیں۔ اسقاط کرنے والی خواتین کی دماغی صحت پر مبنی ایک تحقیق بتاتی ہے کہ اکثر احساس جرم کی شدت (جو کہ ایک انجانی کشش ماں اور بچے کے درمیان ہوا کرتی ہے اس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا) ایسی ماں کو خودکشی کی جانب راغب کر دیتی ہے۔

کیا دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اس زمین کے خزانوں کا تناسب کسی انسان کی سوچ کے احاطہ میں آ سکتا ہے؟ کون جان سکتا ہے کہ کل کا سورج کون دیکھے گا اور کس سحر کی شام کس کی زندگی میں دیکھنا لکھی ہے۔ مستقبل کی باتیں، اس میں جھانکنے اور پیشین گوئیاں کرنے کی فطرت ایک ایسے انسان کی تو ہو نہیں سکتی جو اپنی حدود و قیود سے واقف ہو۔ یقیناً ان خیالات کا اظہار لاعلم لوگ کیا کرتے ہیں۔ رزق کے خزانوں کو انسان کبھی بھی مکمل طور پر نہیں جان سکتا، نہ اس کے لیے ممکن ہے۔ کس کی زندگی کی اسٹاپ واچ کس لمحے رک جائے گی اس کا احاطہ کرنا بھی انسان کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔

لہٰذا زندگی ایک نعمت ہے اس کی قدر کیجئے۔ جو قوانین قدرت اٹل حقیقتوں کی صورت رواں دواں ہیں ان سے مستفید ہونا عقلمندی ہے۔ ان سے ٹکرانے کی صورت پاش پاش ہو جانا مقدر ہوتا ہے۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ والدین کے فرائض میں شامل ہے کہ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کریں کیونکہ ان کے رزق کی اور خود ماں باپ کے رزق کی ذمہ داری اللہ کی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی ذمہ داری ان انسانوں کے ہاتھوں پوری کرواتے ہیں۔ لہٰذا اسلامی نظام معیشت ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا مجاز ہے۔ قرآن کی رو سے امت کے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت ماں باپ کا انفرادی مسئلہ نہیں بلکہ نظام مملکت کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ امت مسلمہ کے سنہری دور میں اگر جھانکیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ حضرت عمرؓ کے دور میں پیدا ہونے والے بچوں کا وظیفہ مقرر ہو جاتا تھا، جب تک جوان ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہو جائیں آج مغربی مغربی ملکوں نے اسلام کا یہ زریں اصول رائج کر کے اپنی قوم کے انسانوں کو تحفظ دیا۔ انگلینڈ میں پیدا ہونے والے ہر بچے کی کفیل حکومت خود ہے۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اس قانون کو Omar's Law کہتے ہیں۔ اسلام جہاں خاندانی نظام کو تحفظ دے کر مضبوط بناتا ہے وہاں حکومت کو ذمہ دار بنا کر خاندان کا مددگار بناتا ہے۔

☆......☆......☆

صلہ رحمی

کہتے ہیں کہ زندگی استاد سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ استاد تو سبق دے کر امتحان لیتا ہے اور زندگی امتحان لے کر سبق دیتی ہے۔

جب سبق ملتا ہے تو زندگی کا بہت سارا حصہ ساتھ چھوڑ چکا ہوتا ہے۔ اس سے قبل کی زندگی میں تعلقات کی کشیدگی، قطع رحمی، ناچاقی، عداوت اور ایک دوسرے کی عزت کے درپے ہونے میں گزر جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں اپنوں کو نیچا دکھانے، مقدمہ بازی اور مال و وقت کی بربادی کی صورت میں دیکھنے میں آتی ہیں۔

اسی لئے اسلام میں صلہ رحمی کی حد درجہ تاکید ہے اور بڑے بڑے درجات کا ذکر ہے۔ مختلف احادیث کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ:

☆ صلہ رحمی سے محبت بڑھتی ہے۔

☆ مال بڑھتا ہے۔

☆ عمر بڑھتی ہے۔

☆ آدمی بری موت نہیں مرتا۔

☆ اس کی مصیبتیں آفتیں ٹلتی رہتی ہیں۔

☆ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

☆ نیکیاں قبول کر لی جاتی ہیں۔

☆ جس قوم میں صلہ رحمی کی عادت ہو جاتی ہے اس قوم پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔

☆ اس عمل کی وجہ سے ملک کی آبادی اور سرسبزی بڑھتی ہے۔

☆ صلہ رحمی کرنے والا اپنا رشتہ اللہ سے جوڑ لیتا ہے۔

☆ جنت میں جانے کا استحقاق حاصل ہوتا ہے۔

نبی پاکؐ نے نصیحت فرمائی کہ تم اپنے نسبوں (رشتہ داریوں) کو سیکھو تاکہ اپنے رشتہ داروں کی پہچان کر کے ان سے صلہ رحمی کر سکو۔

ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ مجھ سے ایک بڑا گناہ ہو گیا ہے، میری توبہ کیوں کر قبول ہو سکتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا: خالہ؟ کہا جی ہاں۔ فرمایا کہ تو اس کے ساتھ حسن سلوک کر۔

ایک مرتبہ آپؐ نے مجمع میں فرمایا کہ جو رشتہ داروں کا پاس و لحاظ نہیں کرتا وہ ہمارے پاس نہ بیٹھے۔ یہ سن کر ایک شخص اٹھ کر چلا گیا۔ اپنی خالہ کے گھر گیا کہ جن سے کچھ بگاڑ تھا۔ معذرت کی اور قصور کی معافی چاہی۔ پھر دربار نبویؐ میں واپس آیا تو آپؐ نے فرمایا اس قوم پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی، جس میں ایسا شخص موجود ہو جو اپنے رشتے داروں سے بگاڑ (ناراضگی) رکھتا ہے۔ (ترغیب و ترہیب)

صلہ رحمی یہ نہیں ہے کہ عزیز و اقارب کے احسن رویہ کے بدلہ میں ان سے اچھا سلوک کیا جائے بلکہ اصل میں صلہ رحمی یہ ہے کہ قرابت دار تعلق منقطع کر رہے ہوں اور وہ انہیں قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ (بخاری شریف) سب سے بہتر صدقہ وہ ہے کہ انسان اپنے ایسے رشتہ دار سے حسن سلوک کرے جو اس کی دشمنی اپنے سینہ میں چھپائے بیٹھا ہو۔

جس طرح روشنی نہ ہو تو اندھیرے جگہ لے لیا کرتے ہیں اسی طرح جہاں صلہ رحمی نہ ہو وہاں قطع رحمی جنم لیتی ہے اور خبر ہی نہیں ہوتی کہ کب سے قطع رحمی سرطان کی طرح انسانی معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔

اصطلاح شرع میں قطع رحمی سے مراد رشتہ داروں سے بھلائی نہ کرنا، ان کی ضروریات پوری نہ کرنا ہے۔ بعض اوقات ہاتھ یا زبان یا رویہ سے ان کو ایذا پہنچانے کو بھی قطع رحمی کہا جاتا ہے۔

آپس کے تعلقات میں کچھ منفی رویے میں جن سے قطعی رحمی کی پہچان ہوتی ہے۔کسی کے ساتھ بھلائی کرنے سے بچنا، خوشی کے موقع پر مبارکباد نہ دینا، غم کی حالت میں تسلی تشفی دینے سے گریز کرنا۔ کسی کی خوبیوں کا اظہار نہ کرنا، میل جول اور خبر گیری کیلئے گھروں میں آمدورفت نہ کرنا۔ یہاں تک کہ مجلس میں اپنے بھائی کو جگہ دینے میں بھی تساہل برتنا۔

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ صلہ رحمی کرنے والوں سے تعلق جوڑتا ہے اور قطع رحمی کرنے والوں سے اپنا تعلق قطع کر لیتا ہے اور اللہ سے کسی کا تعلق کٹ جائے تو اس کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ وہ اللہ کی مدد سے محروم ہو گیا۔ قطع رحمی ایک ایسا فعل ہے کہ جو کسی بھی نیک عمل کی قبولیت کو روک سکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ بنی آدم کے اعمال ہر جمعرات کو اللہ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں لیکن قطع رحمی کرنے والے کا عمل قبول نہیں کیا جاتا۔(مشکوٰۃ)

قطع رحمی کرنے والا ایک ایسے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے کہ جس سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور دل کا سیاہ ہونا اضطراب اور بے چینی کا باعث ہوتا ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اعمال کی سزا و جزا کیلئے یوم الحساب رکھا ہے لیکن قطع رحمی اور والدین کی نافرمانی کی سزا فوری طور پر دنیا میں بھی دیتا ہے تا کہ معاشرے کے دوسرے لوگ قطع رحمی کے ارتکاب سے محتاط رہیں اور معاشرہ کا فساد قوم کا عذاب نہ بنے۔

قطع رحمی کی بنا پر لوگ اس آدمی کے ساتھ اعتماد اور احترام کا رویہ ترک کر دیتے ہیں۔ معاشرہ میں انتشار اور بے سکونی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ’’اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں‘‘ جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں، جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہ لعنت کے مستحق ہیں، ان کے لئے آخرت میں بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔‘‘ (سورۂ رعد ۲۱۔۲۵)

چھوٹی چھوٹی باتوں پر رشتے داروں سے بگاڑ کر لینا، رشتے توڑ دینا یا میل جول ختم کر دینا، یہ وہ حالت ہے جو رسالت کے آنے سے پہلے عرب میں تھی۔ اسلام نے آپس کے تعلقات کو قربانی کی حد تک مستحکم اور خوشگوار بنانے کی تعلیم دی ہے۔

رشتے داروں کیساتھ حسن سلوک پر احسان نہ جتایا جائے۔

رشتے داروں کی عزت کو اپنی عزت ان کی بے عزتی کو اپنی بے عزتی تصور کیا جائے۔ اگر رنجش ہو جائے تو تین دن سے زیادہ سلسلہ کلام بند نہ کیا جائے۔ ان سے غلطی ہو جائے تو ان کو رسوا نہ کریں۔ کوئی جھگڑا پیش آ جائے تو سہولت اور نرمی اور فراخ دلی سے طے کرنے کی کوشش کریں اگر اپنا تھوڑا نقصان بھی ہوتا ہو تو گوارا کر لیں، بگاڑ نہ کریں نیز:

کسی بات سے تکلیف پہنچائیں تو بھی صبر سے کام لیں۔

تعلق توڑنا چاہیں تو خود اس سے باز رہیں۔

دکھ درد میں ہمدردی سے شرکت کی جائے۔

تحفہ تحائف کا تبادلہ کر کے خوشی پہنچائیں۔

ہم میں سے کون ہے جو یہ نہ چاہے گا کہ اس کی عمر میں برکت ہو اس کے کام اس کے ہاتھوں انجام پائیں، وہ اپنے عیال کی ضروریات کی تکمیل کرے۔

ایسے میں آپؐ نے فرمایا کہ جو چاہتا ہے اس کی عمر لمبی ہو اور اس کی موت میں تاخیر ہو تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔ (بخاری شریف)

یہ وہ عمل خیر ہے کہ جب آدمی اپنے اندر پیدا کرتا ہے اپنی حالت درست کرتا ہے معاملات و رویہ کی، تو جو چھوٹی موٹی کوتاہیاں رہ جاتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ اپنی شانِ استغنائی سے درگزر فرماتا ہے اور انسان قرب خداوندی کے درجات طے کرتا ہے۔

☆......☆......☆

محمد صفدر بشیر

ماہ رمضان میں دورِ رسالت کے اہم واقعات

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہنمائی کیلئے اپنی رحمت سے تمام صحیفے جن کی تعداد ۱۰۰ بنتی ہے تمام کے تمام ماہ رمضان میں ہی نازل فرمائے جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

حضرت آدمؑ پر ۱۰، حضرت شیثؑ پر ۵۰، حضرت ادریسؑ پر ۳۰ اور حضرت ابراہیمؑ پر ۱۰، صحیفے اس کے علاوہ حضرت واثلہ بن الاسقعؓ روایت کرتے ہیں کہ تمام الہامی کتب (جن کی تفصیل درج ذیل ہے) بھی اسی مبارک مہینے میں نازل فرمائی گئیں۔

۱۔ تورات عبرانی زبان میں حضرت موسیٰؑ پر ۶ رمضان کو ۲۔ زبور سریانی...... داؤدؑ پر ۱۲ رمضان کو ۳۔ انجیل آرامی...... عیسیٰؑ پر ۱۸ رمضان کو ۴۔ قرآن پاک عربی...... محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ۲۵ رمضان کو لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر اور پھر وہاں سے ۲۲ برسوں میں موقع محل کی مناسبت سے آپؐ کے قلبِ مبارک پر نازل فرمایا گیا۔

(ابن کثیر۔ مسند احمد/ معارف القرآن جلد اوّل ص ۴۴۸)

گویا اللہ تعالیٰ رحمان ورحیم نے تمام امتوں کی رہنمائی کیلئے ماہ رمضان ہی کو منتخب فرمایا اور اسی مبارک مہینے میں قرآن جو کھلی ہدایت اور حق و باطل کی تفریق کرنے والی کتاب ہے۔ نازل فرمائی قرآن پاک میں واضح الفاظ میں فرمایا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنَ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِنَ الْهُدىٰ وَالْفُرْقَان (البقرہ:۱۸۵)

ترجمہ: ''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کیلئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔''

یہ بھی فرمایا:

اِنَّا انْزَلْنٰهُ فِى لَيْلَةِ الْقَدْرِ...... (القدر ۱)

ترجمہ: ''ہم نے اس قرآن کو شبِ قدر میں نازل فرمایا)

قرآن نصیحت بھی ہے، شفاء بھی، رہنمائی بھی ہے اور رحمت بھی۔

سورۂ یونس آیت نمبر ۵۸۔۵۷ میں فرمایا۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآئتكُم مَوعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحمةً لِّلْمُوْمِنِيْنَ. قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا. هُوَاخَيرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْن.

ترجمہ: ''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفاء ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ اے نبیؐ کہو کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے۔ یہ سب ان چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں۔''

گویا یہ مہینہ جشن قرآن منانے کا مہینہ ہے۔ یہ مہینہ خوشیاں منانے کا ہے۔ ہم مختلف مواقع پر خوشیاں مناتے ہیں۔ حقیقی خوشی تو اس نصیحت و رہنمائی اور امراض قلب کی شفا یعنی اس ماہ میں نزول قرآن کی منانی چاہیے۔

آیئے ذرا اس ماہ مبارک میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات پر مختصراً مزید ایک نظر ڈال لیں۔

۱۔ ہجری

یکم ہجری ماہ رمضان میں رسول اکرمؐ نے حضرت حمزہؓ کی قیادت میں پہلا سریہ بھیجا۔ (سریہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں رسول اکرمؐ بہ نفسِ نفیس تشریف نہیں لے جاتے تھے بلکہ کسی صحابی کی قیادت میں جنگی دستہ بھیج دیتے) یہ پہلا سریہ تھا جس کے علمبردار حضرت ابو مرشد غنوی

تھے۔جن کے ہاتھ میں سفید رنگ کا علم تھا۔ یہ سریہ رابغ سے شمالاً ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر عیص کے اطراف میں بحیرہ احمر کے ساحل کی طرف بڑھا۔بحیرہ احمر کے ساحل پر ابوجہل کی سربراہی میں قریش کے قافلہ سے مڈبھیڑ ہوئی مگر لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ محدی بن عمرو جہنی نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور اس طرح فریقین بغیر لڑے بھڑے واپس ہوئے۔

سریہ عمیر بن عدی ۲ ہجری

۲ ہجری رمضان المبارک کا واقعہ ہے۔ بنو امیہ کی ایک شاعرہ عصماء بنت مروان تھی جو اپنے کلام سے اسلام کو نقصان اور آپ ؐ کو ایذا پہنچاتی۔ آپ ؐ نے سن ۲ ہجری میں عمیر بن عدیؓ کو اجازت دی کہ وہ اس بد بخت شاعرہ کو قتل کر دیں۔ انہوں نے اس بد بخت کو قتل کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ ماہ مبارک اسلام کے خلاف سازشیں اور پروپیگنڈہ کرنے والوں سے نمٹنے کا بھی مہینہ ہے۔

غزوۂ بدر۔۲ ہجری

کفر و اسلام کی جس جنگ میں رسول اکرمؐ نے خود بہ نفسِ نفیس شرکت کی اسے غزوہ کہا جاتا ہے۔

کفارِ مکہ رسول اکرمؐ کے محاصرہ اور نگرانی کے باوجود بحفاظت تمام مدینہ پہنچ جانے پر سخت پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ مدینہ کے یہودیوں سے ساز باز کر کے انہوں نے اہل مدینہ کو یہ دھمکی تک دے ڈالی کہ اگر وہ آپ ؐ کو مدینہ سے نکال نہیں دیتے تو پھر لڑائی کے لئے تیار ہو جائیں۔ وہ مکہ میں بھی اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہ آئے اور انہوں نے حضرت سعد بن معاذؓ (جو مدینہ کے ایک مشہور سردار تھے) کو طواف کرنے سے روکا۔ جواب میں حضرت سعدؓ نے بھی انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ اگر تم نے مجھے طواف کرنے سے روکا تو ہم تمہارا تجارتی راستہ روکیں گے۔ شام و فلسطین کی طرف تجارت کے لئے مدینہ منورہ نہایت اہم موقع پر واقع تھا۔ اس اہم تجارتی راستے پر پابندی کا مطلب کفار مکہ کی اقتصادی موت تھی۔ جس کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

۲ ہجری (ماہ شعبان) میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کرنے کا حکم بھی آچکا تھا۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (البقرہ:۱۹۰)

ابوسفیان کی سرکردگی میں قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ مالِ تجارت لے کر آ رہا تھا جیسے معمول کے مطابق مدینہ کے قریب سے ہی گزرنا تھا۔ اس نے حالات کو بھانپتے ہوئے مکہ سے مدد طلب کی جس کے جواب میں ابوجہل تقریباً ایک ہزار مردان جنگی جن میں ۶۰۰ زرہ پوش تھے اور سو سواروں کا رسالہ بھی شامل تھا، پوری شان و شوکت کے ساتھ لڑنے کیلئے نکلا (تفہیم القرآن جلد دوم ص ۱۲۳) آپ ؐ کل ۳۱۳ جانثاروں کے ساتھ کہ جن میں بچے بوڑھے جوان سب ہی شامل تھے۔ (یعنی مقاتل اور جنگجو صحابہ کرام کی تعداد ۳۱۳ نہ تھی بلکہ ان میں دو بچے معاذ اور معوذؓ بھی شامل تھے جو آپ ؐ سے ضد کر کے اس جنگ میں شریک ہوئے تھے اور عمر رسیدہ اور ناتجربہ کار نوجوان بھی) ذرائع نقل و حمل کے نام پر آپ ؐ کے ہمراہ ۷۰ اونٹ اور فقط ۳ گھوڑے تھے۔ سامانِ حرب کی کیفیت یہ تھی کہ اگر کسی کے پاس تلوار تھی تو میان نہ تھی اس نے پرانے کپڑے کے چیتھڑوں میں تلوار کو لپیٹا ہوا تھا اور کسی کے پاس نیزہ تھا تو ڈھال نہ تھی زیادہ تر اصحاب نے کھجور کی شاخوں کو ہتھیار بنایا ہوا تھا۔

اُدھر دشمن اس طمطراق کے ساتھ نکلا تھا۔ گانے بجانے والی لونڈیاں اور شراب کے مشکیزے اس کے ہمراہ تھے۔ اور ہر ہر منزل پر وہ دس دس اونٹ ذبح کرتے تھے۔

ابوسفیان بڑی ہوشیاری سے قافلہ کا راستہ تبدیل کر کے قافلہ کو بچا لے گیا۔

آپ ؐ نے جنگ کے لئے نکلنے کا ارادہ صحابہ کرام کے سامنے پیش کیا۔ تو حضرت مقدادؓ نے ایسا جواب دیا جو رہتی دنیا تک تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ انہوں نے عرض کیا۔

اے اللہ کے رسولؐ۔ آپ ؐ اللہ کے حکم کے مطابق چلتے رہیے۔ ہم آپ کو بنی اسرائیل کی طرح جواب نہیں دیں گے۔ جنہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا۔

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدہ:۲۴)

ترجمہ: ''بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔''

میدان بدر میں آپؐ نے اللہ کے حضور گڑ گڑا کر دعا کی۔

''اے اللہ! یہ قریش کے لوگ ہیں۔ یہ غرور سے اکڑتے ہوئے تجھ سے لڑنے آئے ہیں۔ یہ تیرے دین کی مخالفت پر کمر کسے ہوئے ہیں۔ تیرے رسولؐ کو نا کام کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اے اللہ! تو نے مدد کا وعدہ کیا ہے۔ اس وعدہ کو پورا کر۔ اے اللہ تو نے مجھے ثابت قدم رہنے کے لئے کہا ہے۔ اور ''بڑے گروہ'' کا وعدہ کیا ہے۔ بے شک تو وعدہ پورا کرنے والا ہے۔ (یہاں تک کہ آپؐ کی اس آہ و زاری کے دوران چادر کندھوں سے گر پڑی۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دوبارہ کندھوں پر ڈال دیا۔) خدایا۔ اگر آج یہ جانیں مٹ گئیں تو قیامت تک تیری پرستش نہ ہوگی۔'' اس کے بعد آپؐ نے نشاندہی کی کہ کس کس جگہ دشمن کا کون کون سا شخص قتل ہوگا جنگ کے بعد جائزہ لیا گیا۔ مشرکین کے ۷۰ افراد ان مقامات پر ہی مارے گئے تھے جہاں جہاں اور جس جس کی آپؐ نے نشاندہی کی تھی۔ ۷۰ ہی افراد قید ہوئے۔

اس جنگ میں فقط ۱۴ صحابہ کرام (۶ مہاجرین اور ۸ انصاری) شہید ہوئے۔ جب گھمسان کا رن پڑا تو آپؐ نے مٹھی بھر ریت دشمن کی طرف پھینکی اور فرمایا۔

شَاهَتِ الوُجُوه (چہرے بگڑ جائیں)

مٹھی بھر یہ ریت دشمن کے لئے عذاب بن گئی۔ ذرا غور کیجئے کہ جب یہ مٹھی بھر ریت پھینکی گئی ہوگی تو کسی ایک جانب ہی پھینکی گئی ہوگی مگر اللہ کی شان دیکھئے کہ یہ مٹھی بھر ریت ہر طرف ہر ہر دشمن تک پہنچی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَارَمَيْتَ اِذْرَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ...... (الانفال ۱۷)

ترجمہ: ''جب آپؐ نے پھینکا تو درحقیقت آپؐ نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔''

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے دلوں میں امن اور اطمینان کی کیفیت اس طرح پیدا کی کہ انہیں دشمن کی تعداد کم دکھائی گئی۔ اسی طرح دشمن کی نگاہوں میں مسلمانوں کو کم کر کے دکھایا گیا تا کہ کوئی بھی گروہ مقابلہ سے پہلو تہی نہ کرے اور اللہ اپنا فیصلہ نافذ کر دے اور اپنی نصرت سے حق کو غالب کر دے۔ (مفہوم سورہ انفال آیت ۴۴)

معاذ اور معوذؓ (بچے جو ضد کر کے اس جنگ میں شریک ہوئے تھے) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی نگرانی میں تھے۔ انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے پوچھا کہ دشمنِ اسلام ابوجہل کون ہے۔ جب انہوں نے بتایا کہ وہ شخص جو اپنے دستے کی محافظت میں ہے تو دونوں بچوں نے یکبارگی حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور اس تیزی اور پھرتی کے ساتھ ابوجہل کی طرف لپکے کہ پیشتر اس کے کہ ابوجہل کے محافظ کچھ سمجھ سکتے انہوں نے ابوجہل کو شدید زخمی کر دیا جس کی گردن عبداللہ بن مسعودؓ نے اڑا دی۔

اسی جنگ میں جب آپؐ نے صحابہ کرام کو جنت کی ترغیب دیتے ہوئے جنگ پر ابھارنے کے لئے فرمایا۔

''بڑھو جنت کی طرف۔ جس کی کشادگی زمین و آسمان کے برابر ہے۔ تو حضرت عمیر بن صمام جو کھجوریں کھا رہے تھے۔ انہوں نے کھجوروں کے ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا بلکہ ہاتھ کی کھجوریں بھی پھینک دیں یہ کہتے ہوئے کہ اب یہ جنت میں جا کر ہی کھاؤں گا۔ دشمن کی صفوں میں گھسے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

عظیم الشان فتح، فتح مکہ۔ ۸ ہجری

قریش نے خود ہی معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی اور طاقت کے زعم میں صلح حدیبیہ کی شرائط توڑ ڈالیں اور آپؐ کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ کے خلاف بنوبکر کی مدد کی اور بنوخزاعہ کے بیس آدمی قتل کر ڈالے۔ سیاسی اعتبار سے قریش کی اس عہد شکنی کا نوٹس لینا بے حد ضروری تھا۔ آپؐ نے قریش پر چڑھائی کا فیصلہ تو کیا مگر اس فیصلہ کو مصلحت کے تحت عام نہ کیا بلکہ جنگی اسٹریٹجی (حکمتِ عملی) کے طور پر فتح مکہ سے چند روز قبل حضرت ابوقتادہ بن ربعی انصاریؓ کی قیادت میں ۱۸ افراد پر مشتمل دستہ بطن اضم کی طرف روانہ کیا تا کہ لوگ اسی مغالطہ میں رہیں کہ آپؐ اسی طرف جائیں گے اور کسی کے ذہن میں سفر مکہ کا خیال تک نہ آ سکے ۲۰ رمضان ۸ ہجری) کو آپؐ دس ہزار صحابہ کرام کا لشکر لے کر قریش کے سر پر اس طرح جا پہنچے کہ انہیں کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ یہی آپؐ کی حکمت

عملی تھی کہ آپ ؐ بلدِ امین مکہ معظّمہ میں خون خرابہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ فتح عظیم حاصل ہوئی۔

دنیا کی پہلی جنگ کہ جس میں کوئی خون خرابہ، کوئی قتل و غارت، کوئی لوٹ مار نہیں ہوئی۔ چونکہ آپ ؐ کا حکم تھا کہ:

جب تک کوئی حملہ نہ کرے اس پر حملہ نہ کیا جائے۔

جو شخص ہتھیار ڈال دے اسے قتل نہ کیا جائے۔

جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرے اسے کچھ نہ کہا جائے۔

ابو سفیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لا چکے تھے۔ آپ ؐ نے ان کی قدر افزائی یہ حکم فرما کر کی جو کوئی ابو سفیان کے گھر داخل ہو جائے گا وہ بھی امان پائے گا۔

جو بھاگ جائے اس کا تعاقب نہ کیا جائے۔

آپ ؐ نے خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے ۳۶۰ بت توڑ ڈالے۔ مکہ کی فضا کلمہ توحید سے گونج اٹھی۔ آپ ؐ بتوں کو اپنی لاٹھی کی ٹھوکر سے گراتے ہوئے یہ آیت پڑھتے رہے۔

جَآءَ الحَقُّ وَزَهَقَ البَاطِلَ. اِنَّ البَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا.

ترجمہ: ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔'' (بنی اسرائیل: آیت ۸۱)

پھر آپ ؐ نے عام معافی کا اعلان ان الفاظ میں کیا۔

لَا تَثرِيبَ عَلَيكُمُ اليَومَ ...... اِذهَبُوا فَانتُمُ الطُّلَقَاءُ

ترجمہ: ''تم سے آج کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

فتح مکہ کے بعد قریش کی شان و شوکت خاک میں مل گئی اور جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے جن کا نقشہ خود اللہ سبحانہ تعالیٰ نے سورۃ النصر آیت ۲۔۱ میں کھینچا ہے۔

سریہ خالد بن ولید (نخلہ کی طرف) ۸ ہجری

قریش اور بنو کنانہ کا خصوصی بت عزیٰ نامی نخلہ میں نصب تھا۔ یہ مشرکین کا سب سے بڑا بت تھا جس کی خدمت و حفاظت بنو شیبان اور بنو سلیم کے لوگ کرتے تھے۔ آپ ؐ نے تیس (۳۰) سواروں کے ساتھ حضرت خالد بن ولیدؓ کو اسے گرانے کے لئے بھیجا۔

مسجد ضرار کی مسماری۔ ۹ ہجری

مدینہ کے راہب ابو عامر کی منافقین مدینہ کے ساتھ ساز باز تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے قیصر روم کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا تھا۔ اسی نے مسجد ضرار کی تعمیر کا مشورہ دیا (جس کا ذکر سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۷ میں ہے) اس مسجد کی آڑ میں منافقین مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے صلاح و مشورہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ہرقل روم نے مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاری کی۔ آپ ؐ نے ملک شام کی سرحد پر اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔ ہرقل میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آپ ؐ جب واپس تشریف لائے تو راستے میں سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیات نازل ہوئیں۔ چنانچہ آپ ؐ نے مالک بن دخشم سالمی اور معن بن عدی عجلی کو مسجد ضرار کو جلانے اور مسمار کرنے کا حکم دیا۔

آپ ؐ نے ماہ رمضان ہر سال اعتکاف فرمایا۔ ایک سال بوجہ جہاد اعتکاف نہ فرما سکے تو اس سے اگلے سال بیس (۲۰) دنوں کا اعتکاف فرمایا۔

☆......☆......☆

سراج الحق

تکمیل پاکستان کا ایجنڈا

جماعتِ اسلامی پاکستان کے اجتماع (منعقدہ 20،21،22 نومبر 2015ء) میں سراج الحق صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان کی تقریر تکمیل پاکستان کا ایجنڈا میں سے اقتباسات

اس فانی دنیا میں باعزت اور باوقار زندگی گزارنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ بتایا ہے کہ نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ نبی کریمؐ نیکی کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس لیے ہمیں ان کے امتی ہونے کی حیثیت سے ہر لمحے نہ صرف خود نیکی اختیار کرنی ہے بلکہ نیکی کا حکم بھی دینا ہے۔ برائی سے خود بھی رُکنا ہے اور دوسروں کو بھی روکنا ہے۔ جس کلمۂ توحید لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی بنیاد پر یہ ملک بنا تھا اس کا مقصد بھی نیکی عام کرنا اور بدی کی روک تھام کرنا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دل کی گہرائیوں سے درود وسلام پیش کریں جنہوں نے انسانوں کو اللہ کی بندگی میں زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں امت وسط، یعنی اعتدال والی امت کا درجہ دیا ہے۔ ایک ایسی امت جو انصاف پسند ہو، جو حق کی نصیحت کرنے والی ہو اور ظلم کے خلاف ایک مضبوط قوت ہو۔ ظلم کو روکنا اور ظلم کو ہونے سے بچانا دونوں اس امت کے فرائض میں شامل ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (ال عمران۳:۱۱۰)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس کا تقاضا ہے کہ ہم اسلام میں پورے داخل ہو جائیں۔ ہماری انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی میں کوئی تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ ظاہر اور باطن ایک ہونا چاہیے۔ ہمارا گھر اسلام کا مرکز اور جنت کا نمونہ ہونا چاہیے۔ جہاں والدین کو احترام ملے، بڑوں کو عزت ملے، بچوں کو شفقت ملے اور جہاں میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس بنیں۔ ایک گھر ہمارا یہ ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان بھی ہے۔ ہمیں اس کی عافیت اور بہتری بھی مطلوب ہے۔ ہمیں اس گھر میں بھی اللہ اور اس کے رسول کا حکم نافذ کرنا ہے۔ جس اللہ نے ایک نطفے سے انسان کو بنایا اور انسان کیلئے سارا نظام بنایا اسی اللہ نے ہمیں زندگی گزارنے کیلئے ایک لائحہ عمل دیا ہے جو دین اسلام ہے۔ ہماری دعوت یہی ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط ''یقیناً حکم تو بس اللہ کا ہی ہے'' (انعام ۶:۵۷) اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (اعراف ۷:۵۴) ''جان لو جس کی مخلوق ہے اس کا حکم چلے گا۔''

ہماری دعوت ہے کہ اللہ کی طرف بڑھو۔ اللہ نے حکم دیا ہے:
وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط (الحج ۲۲:۷۸) ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔'' یہ پیغام ہے ہر مسلم اور غیر مسلم کیلئے۔ اس لیے کہ یہ صرف قرآن کا نہیں بلکہ تمام آسمانی کتابوں کا بھی پیغام ہے۔

لاہور، پاکستان کا دل ہے۔ آج سے ۷۴ سال قبل اسی شہر میں اور اسی جگہ پر قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ یہ آزادی اور امن پسندوں کا شہر ہے۔ یہ غلامان مصطفیؐ کا شہر ہے۔ یہ سید علی ہجویریؒ، سید مودودیؒ اور علامہ اقبالؒ کی جائے سکون ہے۔

یہ بلند و بالا مینارِ پاکستان ہماری آزادی اور جدوجہد کی علامت ہے۔ یہاں عظیم بادشاہی مسجد کے سائے میں ہم ایک بار پھر اس بات کا اقرار اور اعلان کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں تیری ہی بادشاہی قبول ہے، ہم تیرے دین کی خدمت کیلئے حاضر ہیں، تیرے دین کی سربلندی، تیرے نام پر جینے اور مر مٹنے کیلئے حاضر ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَo (انعام ۶:۱۶۲)

بیشک میری نماز میری قربانی، میرا جینا مرنا اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔

پاکستان کا اسلامی تشخص

ہم جس کلمہ توحید لا الہ الا اللہ کے کے ماننے والے ہیں، پاکستان اسی کلمے کے نام پر بنا ہے۔ اس کی تقدیر بھی اسلام ہے اور اس کا مستقبل بھی اسلام ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسلام اور پاکستان کو جدا کرسکتی ہے، یا پاکستان کا اسلامی تشخص مٹا سکتی ہے۔ کروڑوں عوام نے اس کے لیے قربانی دی اور آج کروڑوں اس کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں اور آج بھی قربانی کیلئے تیار ہیں۔ آج بعض نادان لوگ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ سیکولر پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کو بہتر معاش کی خاطر بنایا تھا، تو کیا سیکولرازم کے لیے ہندو سے ملنا چاہتے تھے یا جدا ہونا چاہیے تھا؟ یا ایک کافرانہ نظام کے لئے کافروں سے لڑنا تھا؟

برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے یہ خطہ اسلام کی سربلندی اور اللہ کے نظام کے قیام کیلئے حاصل کیا تھا۔ ایک اسلامی پاکستان کے لیے۔ ڈاکٹر صفدر محمود، زندہ مئورخ ہیں، وہ گواہی دیتے ہیں کہ قائداعظم نے قیام پاکستان سے قبل ۱۰۱ مرتبہ، اور پاکستان بن جانے کے بعد ۱۴ مرتبہ یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کا قانون قرآنِ پاک ہوگا۔ انہوں نے امریکی عوام کے نام پیغام دیا تھا کہ پاکستان ایک خالص اسلامی ریاست ہوگی۔ آپ کو معلوم رہے کہ قائداعظم نے مولانا مودودیؒ کو پیغام بھیجا تھا کہ میں مسجد کے لیے ایک ٹکڑا حاصل کر رہا ہوں اور آپ اس کو چلانے کیلئے لوگوں کو تیار کریں۔

قائداعظم نے پاکستان کو مسجد قرار دیا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ قائداعظم کی رحلت کے بعد انگریز کے غلاموں نے اس مسجد پر قبضہ کر لیا۔ کم وبیش تمام ہی حکمرانوں نے عوام کو غلام بنایا، پاکستان کے اداروں کو یرغمال بنایا۔ انہوں نے پاکستان کو اپنی منزل سے محروم کیا، ترقی سے محروم کیا اور یوں پاکستان کو دنیا میں ایک ماڈل اسلامی ریاست بننے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں۔

پاکستان چند پہاڑوں اور دریاؤں کا نام نہیں۔ یہ ایک نظریے، ایک فلسفے، ایک عقیدے اور جاگتی آنکھوں سے دیکھے جانے والے ایک خواب اور منزل کا نام ہے۔ یہ منزل اسلامی پاکستان ہے۔ یہ خوشحال پاکستان ہے۔ یہ نورِ ایمان سے منور پاکستان ہے۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں امامت فرماتے تھے اور میدانِ جہاد میں سالار بھی تھے۔ عدالت میں فیصلے بھی فرماتے تھے اور حکمران بھی تھے۔ غریبوں اور یتیموں کی کفالت بھی کرتے تھے اور اجتماعات بھی کرتے تھے۔

۶۷ برس گزر گئے، پاکستان بنا، انگریز چلا گیا مگر اس کا نظام اب بھی باقی ہے۔ اسی طرح سیاسی نظام، عدالتی نظام اور معاشی نظام جو انگریزوں نے چھوڑا ہے اب بھی باقی ہے۔ اس نظام کی وجہ سے ساری قوم پریشان ہے۔

قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ تحریک پاکستان اس وقت شروع ہوگئی تھی جب ہندوستان میں پہلا مسلمان داخل ہوا تھا۔ تحریک پاکستان برسوں سے جاری تھی مگر قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی۔ اس قرارداد میں مملکت پاکستان کا واضح نقشہ پیش کیا گیا۔ تحریک پاکستان کے سات سال گواہ ہیں کہ قیام پاکستان کا مرکز اور محور قرآن وسنت کو قرار دیا گیا۔ مغرب زدہ لوگ آج بھی قائداعظم پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ پاکستان کو سیکولر بنانا چاہتے تھے حالانکہ قائداعظم، پاکستان کو اسلام اور جمہوریت کا مرکز بنانا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ ”میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو قانون عطا کرنے والے پیغمبرؐ اسلام نے ہمارے لئے بنایا ہے۔“ انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ: ”مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے جائیں گے ہم میں زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا کیونکہ ہم ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک امت کے پیروکار ہیں۔“

آج میں یہ بات واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ تحریک پاکستان میں اس وقت تیزی آئی تھی جب ۱۹۴۵ء میں ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' کا نعرہ تحریک پاکستان میں ایک برقی رو کی طرح داخل ہوا۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ دو سال کی قربانیوں کے بعد پاکستان وجود میں آ گیا۔ یہ تھی طاقت لا الہ الا اللہ کی۔ اور آج سب لوگ جان لیں کہ اس ملک کا مستقبل اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ہی میں ہے۔ قائداعظم کی اس مسجد میں کوئی دوسرا نظام نافذ نہیں ہوسکتا۔

ظلم واستحصال اور درپیش مسائل

قائداعظمؒ نے تو پاکستان اسلام اور جمہوریت کیلئے بنایا مگر یہاں نہ اسلام کو نافذ ہونے دیا گیا اور نہ جمہوریت کو۔ قائداعظم کی وفات کے بعد اس ملک پر مفاد پرستوں نے قبضہ کر لیا۔ جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سول اور ملٹری ڈکٹیٹروں نے بار بار شب خون مارا۔ اسلام اور جمہوریت کیخلاف سازشیں کیں۔ شہری آزادیاں سلب کیں اور قومی خزانے کو لوٹنا شروع کیا۔ ۱۹۵۴ء میں غلام محمد نے اقتدار پر شب خون مارا۔ ۱۹۵۶ء میں پہلا آئین بنا لیکن اس کو چلنے نہیں دیا گیا اور جنرل ایوب خان کا مارشل لا آ گیا۔ ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان کا مارشل لا آ گیا۔ اس عرصے میں اس ملک میں نفرتوں کے بیج بوئے گئے اور سیاسی جماعتوں کو کام نہیں کرنے دیا گیا۔ اخبارات پر پابندی لگائی گئی۔ سیاسی لیڈروں اور صحافیوں کو جیلوں میں ڈالا گیا اور ظلم کی انتہا کر دی گئی۔ ۱۹۷۰ء میں پہلے عام انتخابات ہوئے مشرقی پاکستان میں تو الیکشن نہیں ہوا بلکہ پولنگ اسٹیشنوں پر عوامی لیگی غنڈوں کا مکمل قبضہ رہا اور انہوں نے ۹۹ فیصد نتیجہ اپنے نام کر لیا۔ پھر ان انتخابات کے نتائج کو اسٹیبلشمنٹ اور مفاد پرست جاگیرداروں نے قبول کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیا۔ عوام کے فیصلے کو قبول نہیں کیا گیا اور اقتدار اکثریتی جماعت کے سپرد نہیں کیا گیا۔ پہلے بے اطمینانی اور پھر فساد کی اس فضا سے بھارت نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی فوجوں کو مشرقی پاکستان میں داخل کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے دونوں حصے ایک دوسرے سے جدا کر دیئے گئے۔

۱۹۷۳ء میں بچے کھچے پاکستان میں متفقہ آئین بنا، جس میں چاروں صوبوں اور ملک کی تمام جماعتوں نے دستخط کیئے۔ اس میں مقتدرِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو تسلیم کیا گیا۔ اس دستور میں قرارداد مقاصد شامل ہے۔ اس آئین میں وفاقی شرعی عدالت ہے۔ اس آئین کے مطابق کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جاسکتا۔ اس آئین کے مطابق قرآن وسنت کی تعلیمات کو عام کرنا ہے، عربی زبان کو سکھانا ہے۔ اس آئین کے مطابق اسلام کے منافی کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس آئین کے مطابق کوئی طالع آزما جمہوریت کو ختم نہیں کرسکتا، میرٹ کو ختم نہیں کرسکتا، اظہارِ رائے کے حق کو سلب نہیں کرسکتا۔ عورتوں پر تعلیم کے دروازے بند نہیں ہوسکتے۔ ریاست کے خلاف بغاوت نہیں کی جاسکتی۔ اس آئین میں صوبوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ وسائل کی منصفانہ تقسیم کے فارمولے کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اعلیٰ عدالتوں کو فیصلوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ پارلیمنٹ کی بالادستی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ شفاف انتخابی نظام اور الیکشن کمیشن کی گارنٹی دی گئی ہے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ عملاً یہاں جمہوریت کو پنپنے نہیں دیا گیا۔

۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاءالحق نے اسی دستور کو لپیٹ کر الماری میں رکھ دیا اور من مانی ترامیم کر کے اپنے اقتدار کو طوالت بخشی۔ یہاں پر پیش نظر رہے کہ وہی بھٹو صاحب جنہوں نے اس دستور کو بنوایا تھا انہوں نے چند ہی ماہ بعد اس کا حلیہ تبدیل کر کے اپنی آمریت کو تقویت بخشی تھی۔ اس آئین شکنی نے ایک دوسرے آئین شکن کو دستور کی خلاف ورزی کا راستہ دکھایا۔

بعد میں جمہوریت تو بحال ہوئی مگر سیاسی قوتوں اور مقتدر طاقتوں کی لڑائی اور بدترین لوٹ کھسوٹ نے معاملات کو سلجھنے نہ دیا۔ اسی دوران میں ۱۹۹۹ء میں پرویز مشرف نے آئین کو توڑنے کا گناہ کیا اور پھر دوسری مرتبہ ۲۰۰۷ء میں بندوق کے زور پر آئین کو پامال کیا۔ نیز ۲۰۰۱ء میں اس کمانڈو جرنیل نے ملک کی عزت کو ایک ٹیلی فون کال پر امریکہ کے سپرد کیا۔ اپنی بہنوں اور بھائیوں کو ڈالروں کے عوض بیچ ڈالا۔ آج بھی پرویز مشرف کی وجہ سے ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور کئی پاکستانی امریکہ کی جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ سینکڑوں پاکستانی لاپتہ ہو گئے ہیں۔

بلوچستان میں آپریشن کے ذریعے بلوچوں کو ملک چھوڑنے یا پہاڑوں پر چڑھ کر گوریلا جنگ پر مجبور کر دیا۔ مسئلہ کشمیر کو سرد خانے میں ڈالا اور لاکھوں کشمیری شہدا کے خون سے بے وفائی کی۔ انجام کار ملک میں انتہا پسندی کو فروغ ملا۔ بے حیائی کا سیلاب لایا گیا اور ملک کے تعلیمی نصاب کو غیر اسلامی بنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جب وہ اپنے اقتدار سے ہٹا تو اسے گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ وی آئی پی بنایا گیا۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے کہ جہاں ملک اور آئین توڑنے والوں کو، اپنی بہنوں کو بیچنے اور اپنی فضائیں دشمنوں کو دینے والوں کو وی آئی پی بنا کر رکھا گیا ہے۔

آئین کی بار بار پامالی سے یہ ملک بھی ٹوٹا، اس کے ادارے بھی تباہ ہوئے۔ یہ آئین کئی مرتبہ بے توقیر ہوا۔ اس ملک میں نہ اسلام کو آنے دیا گیا، نہ جمہوریت کو جڑ پکڑنے دی گئی۔ جس کے پاس دولت تھی یا بندوق، اس نے اس ملک کا ستیاناس کر دیا۔ اس ملک کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس ملک کے شہریوں کو بنیادی حقوق سے محروم کیا۔ اسلامی حقوق، معاشی حقوق اور معاشرتی حقوق سے محروم کیا۔ تعلیم اور صحت کی سہولت سے محروم کیا۔ اچھے ماحول سے محروم رکھا۔ معاشی ترقی کے امکانات ختم کر کے نوجوانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کئے گئے۔ ہسپتالوں اور سکولوں میں طبقاتی نظام لایا گیا۔ مزدوروں کو ان کا حق نہیں دیا گیا۔ اس ملک میں کرپٹ اشرافیہ نے آمروں اور مفاد پرستوں کے ساتھ مل کر پاکستان کے انتظامی ڈھانچے کو تباہ کیا، پولیس کو تباہ کیا، ٹیکسوں کے نظام کو تباہ کیا، کرپشن کو عام کیا، اقرباء پروری کو عام کیا، طبقاتی نظام کو دوام بخشا اور سارے اداروں کو تباہ و برباد کیا۔

آج ملک کا کوئی بھی ادارہ چوروں اور لٹیروں سے، ظالموں اور استحصالیوں سے خالی نہیں۔ ہر طرف وی آئی پی کلچر کا راج ہے۔ تھانوں میں، عدالتوں میں، ہسپتالوں میں، سکولوں میں، دفتروں میں وی آئی پی کلچر ہے۔ ملک کو مٹھی بھر اشرافیہ نے اپنے مفادات کی خاطر تقسیم در تقسیم کیا۔ مذہبی منافرت پھیلائی، مسلکی جھگڑے پیدا کئے، فرقہ پرستوں کی حوصلہ افزائی کی اور سیاسی انتشار پیدا کیا۔ کسی کو اقتدار میں لائے اور کسی کو محروم کیا۔ انتخابات، پارلیمنٹ اور قومی اداروں کو بے وقعت کیا۔ اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے امریکی دہشت گردی کا ساتھ دیا۔ معاشی نظام کو برباد کر کے غریبوں سے دو وقت کی روٹی چھین لی۔ مہنگائی میں اضافہ کر دیا۔ سی این جی کو نایاب کر دیا۔ گیس اور بجلی کے بلوں میں اضافہ کر دیا۔ کرائے بڑھ گئے، فیسیں بڑھ گئیں۔ ہر طرف بھوک کے سائے نظر آ رہے ہیں۔ ہر طرف غربت ناچ رہی ہے۔ ہر طرف لاقانونیت ہے، بھتے ہیں، کمیشن ہے اور ٹارگٹ کلنگ ہے۔ کیا یہ قائداعظمؒ کی خوابوں کی تعبیر ہے؟ کیا اس کیلئے مسلمانوں نے قربانی دی تھی؟ کیا اس کیلئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا؟

سوات آپریشن کے دوران لاکھوں لوگ اپنے ہی ملک میں مہاجر بنا دیئے گئے اور کیمپوں میں ان کی تذلیل ہوئی۔ اب فاٹا اور شمالی وزیرستان میں اسی طرح آپریشن کیا جا رہا ہے۔ 9 لاکھ قبائلی پاکستانی اپنے ہی ملک میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ وہ خواتین جو حیا کی وجہ سے ڈاکٹروں کے پاس بھی نہیں جاتی تھیں ان کو کیمپوں میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ آج ان کا کوئی والی وارث نہیں۔ آج امریکہ کو بتایا جا رہا ہے کہ: ''ہندوستان کی کارروائیوں کی وجہ سے ہمارے ہاتھوں اپنے ہی پاکستانیوں کیخلاف آپریشن متاثر ہو گیا ہے۔'' میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ قبائلی محبِّ وطن پاکستانی ہیں۔ ان کی تذلیل بند کی جائے اور ان کے خلاف آپریشن بند کیا جائے اور ان کو اپنے گھروں کو عزت کے ساتھ جانے دیا جائے۔ قبائلیوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کا ازالہ کیا جائے اور امریکہ کی مسلط کردہ جنگ سے باہر نکلا جائے۔

اس ملک میں کرپٹ اشرافیہ اور اقتدار پرستوں کی جائنٹ فیملی ہے جس میں میڈیا کا ایک حصہ بھی ان کے قدموں میں بیٹھا نظر آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دولت کی ریل پیل میں حق اور سچ سامنے نہیں آتا۔

قومی ایجنڈا

ہمیں قوم کو روشنی کے گرد اکٹھا کرنا ہے، امید کی شمع روشن کرنی ہے۔ ہم محروموں، مظلوموں، مزدوروں اور مجبوروں کو پیغام دیتے ہیں کہ جماعت اسلامی عام آدمیوں اور غریب عوام کی اصل جماعت ہے۔ یہاں موروثی اور خاندانی سیاست نہیں ہے۔ یہاں کوئی گدی نشین نہیں

ہے۔ آیئے ہم سب مل کر مٹھی بھر کرپٹ اشرافیہ کی کرپٹ فیملی کا مقابلہ کریں۔ اسلامی پاکستان کیلئے، جمہوری پاکستان کیلئے، فلاحی پاکستان کیلئے، پروگریسیو پاکستان کیلئے ایک ہو جائیں تاکہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں نظر آئیں۔

ہم یہاں ہر فرد کو خوش حال اور پرامن دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرد خوش حال ہوگا تو قوم خوش حال ہوگی، پھر ریاست بھی خوشحال ہوگی۔ اس کے لیے انقلابی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کیلئے ہم قومی ایجنڈا پیش کرتے ہیں۔ (وہ طوالت کے باعث اس تقریر میں شامل نہیں کیا گیا)

قوم سے اپیل

ہم پاکستان کو ایک اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ ایک ایسی ریاست جہاں حاکمیت اور شریعت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہوگی اور حکومت عوام کے مخلص نمائندوں کی۔ اس مقصد کیلئے عوام ہمارا ساتھ دیں۔ ہمارے پاس وژن ہے، ہمارے پاس ماہرین اور مخلص کارکنان کی ٹیم ہے۔ ہم عوام کے تعاون سے 'اسٹیٹس کو' کو شکست دیں گے۔

جماعت اسلامی ہی کرپشن کا سومنات توڑ سکتی ہے۔ ہم نے ہر دور میں قربانی دی ہے۔ پاکستان کی محبت میں جماعت اسلامی کے قائدین کے جنازے جیلوں سے نکل رہے ہیں۔ ہم زلزلوں اور سیلاب کی مصیبت میں عوام کے ساتھ کھڑے رہے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ فلسطینیوں کا ساتھ دیا۔ کشمیر کے بھارتی تسلط سے نجات کی جدوجہد کا ساتھ دیا ہے۔ عالمِ اسلام اور دنیا کے تمام مظلوم انسانوں کی اپنے حقوق کیلئے جدوجہد کی بھرپور تائید کی ہے

سر جلائے ہیں مشعلوں کی طرح
یوں بھی لوگوں کی رہبری کی ہے

ہمارا ایجنڈا قوم نے قبول کیا تو ہم آپ کو ایک ایسی حکومت دیں گے جس میں کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوگا۔ ایک ایسی حکومت جس کا وزیر اعظم صحیح معنوں میں ۱۸ کروڑ عوام کی قیادت کر سکے۔ مسجد میں امامت بھی کر سکے اور اقوام متحدہ میں ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی نمائندگی بھی کر سکے۔ میں ساری جماعتوں سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس ملک کی خاطر ہمارے ایجنڈے کے مطابق پاکستان کی تعمیر نو کیلئے ہمارا ساتھ دیں اور ہم سب مل کر وہ جدوجہد کریں جس کے نتیجے میں یہ ملک ترقی کر سکے اور اپنی اصل منزل کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ یہ ایک پارٹی کا نہیں پوری قوم کا ایجنڈا ہے اور ہم سب کو ہمہ گیر مشترکہ جدوجہد کیلئے پکار رہا ہے۔

☆......☆......☆

غزل

جو دور کوئی کنارہ دکھائی دیتا ہے
وہاں بھی آگ کا دریا دکھائی دیتا ہے

مگر وہ آنکھ جو محرومِ روشنی ہو اسے
سحر کا رنگ بھی کالا دکھائی دیتا ہے

بس ایک آس کبھی تو خیال آئے گا
وہ کون ہے جو اکیلا دکھائی دیتا ہے

یہ سچ ہے اس سے نہیں کوئی بھی شناسائی
مگر یہ کیا ہے کہ دیکھا دکھائی دیتا ہے

بہر لحاظ یہ افسانہ وجود و عدم
ترے بغیر ادھورا دکھائی دیتا ہے

ہر ایک شعر میں الفاظ کی فسوں کاری
ہر اک خیال اچھوتا دکھائی دیتا ہے

حذر حذر کہ یہی سوچ کھا نہ جائے ہمیں
یہ کون ہے یہ کہاں کا دکھائی دیتا ہے

تصورات میں لاکر گرفت میں لے لوں
جو مثلِ خوشبوئے لالہ دکھائی دیتا ہے

نہ جانے کب سے انہیں گنبدوں میں گونجتی ہے
صدا کا جرم بلا کا دکھائی دیتا ہے

حبیب الرحمٰن

غزل

دشتِ جنوں میں دِن دنِ بھر ہم یوں بولائے پھرتے ہیں
جو جھوٹ تمہارے منہ سے جھڑے پلکوں پہ اٹھائے پھرتے ہیں

ہم منتظر طوفاں تھے مگر بستی کی طرف آیا ہی نہیں
معلوم ہوا کچھ اہلِ جنوں اسے سر پہ اٹھائے پھرتے ہیں

ہم چاک گریباں کر نہ سکے پوچھے جو کوئی دکھلائیں کبھی
سب داغ تمہاری چاہت کے سینے پہ سجائے پھرتے ہیں

لوگوں نے رشتوں ناطوں اور قدروں کے قلادے پھینک دیئے
لیکن کچھ پاگل ہم جیسے کاندھوں پہ اٹھائے پھرتے ہیں

جو چاند کے منہ پہ دھبے ہیں یہ اس کی وفا کے تمغے ہیں
کیوں لوگ ذرا سی بات پہ پھر چہرے کو چھپائے پھرتے ہیں

آمنہ رمیصا زاہدی

غزل

کبھی سپنے نہیں دیکھو کہ سپنے ٹوٹ جاتے ہیں
جنہیں اپنا بناتے ہیں وہ اکثر چھوٹ جاتے ہیں

یہ سپنے کانچ سے بھی بڑھ کے نازُک آ بگینے ہیں
ذرا سی ٹھیس لگ جائے تو فوراً ٹوٹ جاتے ہیں

سیہ آنکھوں میں یہ سپنے بہت سندر تو لگتے ہیں
مگر جب ٹوٹ جاتے ہیں، مقدر پھوٹ جاتے ہیں

کبھی سوچا ہے تم نے بھی دلوں کی چوٹ کو ساتھی!
کبھی جڑتے نہیں وہ دل جو یکسر ٹوٹ جاتے ہیں

کبھی ساحل پہ ہم نے بھی گھروندا اک بنایا تھا
خبر کیا تھی کہ لہروں سے گھروندے ٹوٹ جاتے ہیں

حریم شفیق

محبت

کسی کی چاہتوں کا، الفتوں کا، جانثاری کا
کسی کے رت جگوں کا، خون دل کا، اشک باری کا
محبت قرض ہوتی ہے.........................

یہ آنکھوں سے ٹپکتی ہے یہ باتوں سے جھلکتی ہے
یہ سانسوں میں مہکتی ہے یہ چہروں میں دمکتی ہے

کبھی برکھارتوں میں یہ سہانے خواب بُنتی ہے
کبھی یہ ساحلوں سے گوہر نایاب چنتی ہے
کبھی یہ حکم دیتی ہے کبھی یہ عرض ہوتی ہے
محبت قرض ہوتی ہے.........................

یہ دامن سے لپٹتی ہے دِلوں کو گدگداتی ہے
کبھی پہروں ہنساتی ہے کبھی شب بھر رُلاتی ہے
نہ مرنے دے نہ جینے دے اگر بالفرض ہوتی ہے
محبت قرض ہوتی ہے.........................

شبنم طارق

افشاں نوید

میں قریب ہوں کسی اور کے!

میں ''اسکائپ'' پر آسٹریلیا میں اپنے بھانجے سے گفتگو میں مصروف تھی۔ دروازے پر تین بار گھنٹی بجی۔ میں نے نظر انداز کر دیا کیونکہ بہت دنوں بعد اس سے گفتگو ہو رہی تھی اور موضوع تھا اس کی شادی! سو گفتگو یوں سمیٹنا بھی آسان نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کام والی ماسی آئی تو اس نے بتایا کہ سامنے گھر میں رہائشی مسز کمال کے چھوٹے بیٹے کو تیز بخار تھا۔ اچانک تھرمامیٹر گر کر ٹوٹ گیا۔ انہوں نے وقفے وقفے سے آپ کے دروازے پر بیل دی پھر جواب نہ پا کر دوسرے پڑوسیوں کے ہاں سے تھرمامیٹر لے لیا۔ اوہ! واقعی افسوس ہوا مجھے کہ میری ذرا سی لاپروائی ان کی تکلیف میں اضافے کا باعث بن گئی۔

اس وقت کچھ فرصت کی گھڑیاں میسر تھیں کام والی کام نمٹا کر جا چکی تھی۔ میں سیل فون پر 'میل بکس' کھول کر بیٹھ گئی۔ انتہائی ارجنٹ میل تھیں۔ اوہ یہ تو جواب دینے میں بہت تاخیر ہو گئی۔ اس دوران واٹس ایپ پر بھتیجی کا پیغام ملتا رہا کہ ''پھپھو میں آپ کے گھر آ جاؤں؟'' میں نے سوچا میلز کے جواب دے کر فارغ ہو جاؤں تو اس کو جواب دیتی ہوں۔ جانے کیوں اتنی عجلت کا مظاہرہ کر رہی ہے وہ......

ابھی میلز کے جواب دے کر فارغ ہوئی تھی کہ بچے آ گئے اسکول سے۔ ذہن سے نکل گیا کہ ماریہ بار بار آنے کو کہہ رہی تھی۔

ابھی بچوں کے لنچ سے فارغ ہوئی تھی کہ ''وائبر'' پر یونیورسٹی کی پرانی دوست کی کال آ گئی۔ کسی گم گشتہ یادوں میں بسے فرد سے یوں رابطہ ہونا کتنا اچھا لگتا ہے! ہم دونوں ایک دوسرے سے لمبی گفتگو کرتے رہے۔ بچوں کے حال احوال ان کے کیریئر پر گفتگو کرو تو ایک طویل مباحثے کا عنوان بن جاتا ہے یہ......

میری بیٹی کوچنگ سینٹر جاتے جاتے پلٹ آئی۔ اس نے مجھ سے بات کرنا چاہی میں نے اشاروں میں کہا کہ بعد میں بات کر لینا فرحین آنٹی کا ایک زمانے کے بعد فون آیا ہے۔ وہ میرا انہماک دیکھتے ہوئے بے دلی سے قدم اٹھاتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ شام کو آ کر اس نے بتایا کہ کل سویرے ایک طالبہ کا گردے کی تبدیلی کا آپریشن ہے آج پیسے جمع کرانا تھے۔ جو وہ نہیں کرا سکی کل تو کوچنگ آف ہے ویک اینڈ کی وجہ سے میں نے استاد سے معذرت کر لی کہ میں وجیہا کے آپریشن کے سلسلے میں مدد نہیں کر سکتی۔ یہ تو بہت برا ہوا، تم ایک مستحق طالبہ کی مدد نہ کر سکیں۔ تم نے مجھے بتایا ہی کب تھا۔'' میں اپنی خجالت مٹانے کو بولی تو اس نے تو...... میں نے کہا بار بار آپ سے بات کرنا چاہی لیکن آپ نے کوئی توجہ ہی نہ دی۔ کوئی بات نہیں امی۔ ایسا تو اکثر ہو جاتا ہے!'' کہتے ہوئے روہانسی ہو کر وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اب کیا کروں میں نے تو کال کی نہیں تھی۔ ایک عرصے بعد میری دوست کی کال آئی تو اس کا حق تھا کہ میں اس کو وقت دوں۔ چلو نیکی کے مواقع تو بار بار آتے ہیں۔ گھڑی پر نظر ڈالی ابھی تو میاں کے آنے میں گھنٹہ باقی ہے۔ سو میں فیس بک کھول کر بیٹھ گئی۔ کیا زبردست چیز ہے یہ بھی...... لمحوں میں سینکڑوں لوگوں کے حالات سے آگاہی، ان کے بچوں کی نئی تصاویر۔ دوست احباب کی مصروفیت۔ دنیا بھر کے حالات سے آگہی، مزے دار چٹکلے، ایک نئی دنیا آباد ہے یہاں تو...... اس دوران پی ٹی سی ایل کی گھنٹی بجتی رہی لیکن میں اپنے اسٹیٹس کو اپ ڈیٹ کرنے میں ایسی مگن تھی کہ توجہ بھی نہ دے سکی...... پھر ضروری بھی نہیں کہ لپک لپک کر ہر فون بھی ریسیو کیا جائے۔ جس کو ضرورت ہو گی دوبارہ رجوع کر لے گا۔ فیس بک سے نظر ہٹی تو اندازہ ہوا کہ مغرب کا وقت نکلتے نکلتے رہ گیا۔ شکر نماز قضا ہونے سے بچ گئی۔ رات گئے بہن کا فون آیا تو وہ بولی کہ بھابھی امی کا انتقال ہو گیا تمہیں کال کرتی رہی۔ موبائل اور لینڈ لائن پر رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میں خود ہی ہو آئی عشاء میں تدفین تھی ان کی

اوہ دل یکبارگی پھر شرمندہ سا ہوگیا۔اس وقت تو میں فیس بک پر مصروف تھی تو بار بار بجنے والی فون کی گھنٹی میری چھوٹی بہن کی تھی جو مجھے انتقال کی خبر دینا چاہ رہی تھی۔ چلو بعد میں تعزیت کر آؤں گی تدفین میں تو نہ جا سکی۔ بڑی محبت کرنے والی ہستی تھیں وہ...... ایسی شفیق ہستیاں ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتی جا رہی ہیں۔ان کا آخری دیدار تک نہ کر سکی۔

اسی اثناء میں خیال آیا کہ بھتیجی صبح سے رابطہ کر رہی تھی کہ آنا چاہتی ہوں اس سے پوچھ لوں خیریت۔ جب رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ بھابھی آج لاہور واپس جا رہی تھی۔ ان کی ملنے کی خواہش تھی۔ وہ شام کی فلائیٹ سے چلی گئی ہیں۔ میں بھتیجی کو بروقت Reply نہ کر سکی۔ وہ سمجھی کہ میں بہت مصروف ہوں۔ یوں بھابھی سے ملاقات کا موقع بھی گیا۔ خیر وہ تو چکر لگاتی رہتی ہیں۔ سال میں ایک دو بار...... پھر مل لوں گی۔ میں نے اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

یہ سماجی رابطوں کی دنیا عجیب دنیا ہے۔ کتنا مصروف ہے انسان! سینکڑوں دوستوں کے سرکل...... درجنوں گروپس...... سینکڑوں پیغامات......اب نسبتاً ایک بڑے سماج کا حصہ ہیں ہم...... یہ دنیائیں اتنا منہمک رکھتی ہیں ہمیں کہ اپنے اطراف سے بےگانہ ہوتے جا رہے ہیں ہم۔ میں اپنی بہن کے ہمراہ تعزیت کیلئے جا رہی تھی کہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے بہت سی دل کی باتیں کروں لیکن اس کی انگلیاں مسلسل اینڈ رائڈ پر چلتی رہیں۔ اسکرین پر ایک کے بعد ایک منظر بدلتا رہا۔ وہ اتنا مدہوش تھی اس دنیا میں کہ برابر میں بیٹھے میرے وجود کو محسوس تک نہ کر سکی۔ کیسے ہیں یہ سماجی رابطے کہ ہم قریب والے سے بےگانہ اور دور کی دنیا کو بسائے رکھنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ع

میں قریب ہوں کسی اور کے مجھے ڈھونڈتا کوئی اور ہے!

یہ ٹیکنالوجی تو ''وقت کی امام'' بن گئی جس نے ''حاضر و موجود'' سے بےزار کر دیا ہمیں۔ لیپ ٹاپ پر بیٹھے بیٹے کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ باپ دوسرے کمرے میں کھانستے کھانستے بےحال ہو چکا ہے۔ ماؤں کے پاس وقت ہے بچوں کے لئے نہ شوہروں کے پاس اہل خانہ کے لئے۔ ہم قریب کی دنیا سے لاتعلق ہوتے جا رہے ہیں اس لئے کہ ایک بڑی دنیا کے باسی ہیں ہم اب آج صبح سے رات تک کی مصروفیات پر نظر ڈال کر دل بہت بوجھل سا ہو گیا کہ میں ان سینکڑوں لوگوں کو میسر تھی جو میرے قریب نہیں۔ لیکن میں ضرورت کے وقت نہ پڑوسن کو میسر ہو سکی نہ اپنی بیٹی کو نہ ایک بھابھی کی والدہ کے انتقال میں جا سکی نہ دوسری بیرون شہر سے آئی بھابھی سے ملاقات ہو سکی اور ایسا بہت کچھ ہو رہا ہے۔ ہم ایک وقت میں کسی ایک کو ہی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم وائبر، واٹس ایپ، فیس بک، اسکائپ وغیرہ پر تو اپنے احباب کے ایک بڑے سرکل کو دستیاب ہوتے ہیں لیکن اپنے پڑوسی اور اہل خانہ کو نہیں۔ اس میں قصور کیا جدید ٹیکنالوجی کا ہی ہے؟۔

سماجی رابطوں کی یہ دنیا بھی تو ہماری ہی ہے۔ کوئی بات نہیں اگر میں ان کو دستیاب نہ ہو سکی جن کو ''میری ضرورت'' تھی۔

میں نے سر جھٹک کر ''اینڈ رائڈ'' کو پھر سے چارجنگ پر لگا دیا۔

☆......☆......☆

صبیحہ نبوت خان

میرے پارٹنرز

اس دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں کا بڑے زور شور سے انتظار تھا کیونکہ بچوں کے ابا نے کہا تھا ان گرمیوں میں ایبٹ آباد یا مری چلیں گے۔ دونوں جگہیں بچوں کے لئے نئی تھیں۔ ویسے بھی سیر کا ذکر ہو تو بچے کھل اٹھتے ہیں۔ لہٰذا چھٹیاں ہوتے ہی سب نے جلدی جلدی اسکول کا کام ختم کیا اور تفریح کا پروگرام بن گیا۔

میں نے بھی شکر کیا کہ چلو اچھا ہے۔ ہم بھی کچھ دن سکون سے گزاریں گے کچھ آرام بھی کریں گے اور کچھ ادھورے کام جو ٹلتے رہتے ہیں پایہ تکمیل کو پہنچیں گے پھر بچوں کو بھی گرمی سے نجات ملے گی یوں سب کے عیش ہوں گے۔ رات کو لیٹے ہوئے ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ دھپ سے کمر پر کسی نے ہاتھ مارا۔ ''ککا...... ککا'' (یہ میرا پیار کا نام تھا) میں نے کروٹ لے کر پوچھا ''ارے تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔ پتہ ہے رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔''

مجھے آپ کے پاس سونا ہے۔ ایک معصوم سی پیاری آواز آئی جس نے خیالات کے تانے بانے بکھیر دیئے میں نے جھٹ سے اسے گود میں لیا۔ پیار کیا اور اپنے سینے سے لگا لیا...... ''تکیے پر لٹا دیں چلو لیٹو اور سو جاؤ۔'' میں نے تھپکی دی۔ ''کہانی سنا دیں۔''

''بھئی سو جاؤ مجھے نیند آرہی ہے۔'' میں نے کروٹ لے لی۔

چند لمحے گزرے تھے کہ کسی نے ہلایا میں نے خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ ککا مجھے ڈر لگ رہا ہے ''لائیٹ جلا دیں۔''

پھر کسی نے مجھے زور زور سے جھنجھوڑا۔ ''اف اللہ سونے دو۔''

''مجھے امی کے پاس جانا ہے۔''

میں نے دل میں شکر ادا کیا۔ جلدی سے اتارا اور خدا حافظ کہا۔

لیکن میری نیند اب غائب ہو چکی تھی۔ رات کے دو بجے تھے۔ میں نے کتاب اٹھائی تین بجے تک وہ پڑھی پھر تہجد کی نماز پڑھی اور صبح کا انتظار کرنے لگی۔

یوں صبح ہو گئی۔ سورج کی پہلی کرن نے کھڑکی سے جھانکا یعنی مزید صبح کی نوید دی اور میں نے بستر چھوڑ دیا پھر وہی گھر کے کام اور افراتفری۔

آٹھ بجے سب کو ناشتہ چاہیے تھا دیکھا تو میز پر تینوں حضرات براجمان ہیں اور فرمائشیں شروع۔ ''میرے لئے کیا بنایا ہے ایک طرف سے آواز آئی۔ ''میٹھا پراٹھا۔'' یہ لیجئے جناب میں نے جلدی سے پلیٹ آگے بڑھائی۔ میٹھا پراٹھا دیکھتے ہی بولے واہ واہ...... باچھیں کھل گئیں ''مزہ آ گیا۔'' مجھے کباب پراٹھا کھانا ہے۔ مجھے آئس کریم چاہیے۔ غرضیکہ فرمائشوں کا ایک ڈھیر تھا مزے مزے کی معصوم سی شرارتیں تھیں، دل لگی تھی جس میں مجھے اپنے کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ تھا۔ سب کی پسند کی چیزیں ہر وقت گھر میں ہوتی تھیں۔ یہ سب سوچنا اور تیار رکھنا میرے ذمہ تھا۔

ناشتہ ختم ہوا تو میں نے سوچا اب کچھ فراغت ہو گی۔ بچے اپنا کام کریں گے، میں بھی کچھ اپنا کام کرلوں کاغذ قلم نکالا اور کچھ لکھنے کا موڈ بنایا۔ اتنے میں آواز آئی ''مجھے بھی کلر کرنا ہے'' ارے تو کرلو نا! ''کہاں بیٹھوں۔'' ''یہیں بیٹھ جاؤ۔'' بغیر دیکھے میں نے جگہ بنا دی پھر آواز آئی۔

''کونسا کلر کروں؟''

''ریڈ کرلو۔''

کچھ سوچ کر پھر بولی۔ ''بھالو کوئی ریڈ ہوتا ہے۔''

میں نے گھوم کر دیکھا۔ واقعی بھالو تھا۔ ''بھالو ہے تو براؤن کرلو۔ لیکن جب آپ کو پتہ ہے تو مجھے کیوں تنگ کر رہی ہو''۔ میں نے ذرا غصے سے کہا۔

اتنا کہنا تھا کہ خاموشی چھا گئی۔ مجھے اس خاموشی پر پریشانی ہوئی۔ کن انکھیوں سے دیکھا۔ ''کیوں کیا ہوا کلر کرلیا۔''

’’آپ نے مجھے ڈانٹا ہے۔ میں نہیں بولتی۔‘‘ ایک باریک سی رونی آواز نے مجھے پریشان کردیا۔

کاغذ قلم بند کیا سارے خیالات فضا میں تحلیل ہو گئے ’’ارے ناراض ہوگئیں۔ میں کوئی آپ کو ڈانٹ سکتی ہوں۔ میں تو بہت پیار کرتی ہوں‘‘ یہ کہہ کر میں نے ببلی کو گود میں لیا۔ گدگدی کی، ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا اور اس میں ہم دونوں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔ فضا میں وہی نرمی، وہی پیار، وہی محبت کی خوشبو بکھرنے لگی۔

اب میں مکمل طور پر ببلی کے ساتھ تھی۔ اتنے میں بڑے بھائی سپارہ لئے ہوئے آئے ’’میرا سبق سن لیں۔‘‘ چلو بھئی اب ان کا سبق سنتے ہیں۔ مجھے بھی سپارہ پڑھنا ہے۔ دوسرے صاحب بھی آ گئے۔ جی ضرور......اور یوں مکتب کھل گیا۔

زندگی کے یہی شب و روز تھے۔ کچھ لکھنے کو دل چاہتا تو وقت نہیں ہوتا اور جب وقت ہوتا تو موڈ نہیں بنتا۔ آج بچے گئے ہوئے تھے گھر خالی تھا کام بھی نہیں تھا وقت ہی وقت تھا کسی کی فرمائش تھی نہ کسی کو سلانا اور نہ کھلانا نہ ہی کسی کی ناراضگی کا خوف۔ کئی دفعہ کاغذ قلم نکالا۔ ابھی کچھ لکھنا شروع ہی کرتی کہ کلکا...... کلکا کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ہر دروازے سے ایک معصوم سا چہرہ جھانکتا۔ ’’ہمیں بھی کلر کرنا ہے۔‘‘ مسکرا کر قریب آتا اور میں انگلی پکڑ کر کمرے سے باہر آجاتی۔ ’’آؤ کرلو۔‘‘

لیکن آج یہ پہلا اتفاق کہ نماز میں نے تسلی سے پڑھی تھی خوب دل لگا کر دعا مانگ رہی تھی۔ اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ دل سے دعا نکل رہی تھی آنسوؤں کا جل تھل تھا۔ ہاتھ اٹھے ہوئے تھے ہونٹ ہل رہے تھے کہ آواز آئی۔

’’کس نے مارا ہے۔‘‘

گردن خود بہ خود گھوم گئی۔ وہی معصوم چہرے وہی پیاری آوازیں۔ کسی نے ہاتھ پکڑا کسی نے پاؤں۔ ’’کیا یہاں درد ہو رہا ہے‘‘ وہی پریشانی جوان کو میری ذرا سی تکلیف میں ہوتی تھی۔ ہر آواز میرے رونے سے پریشان تھی۔ ’’اف اللہ تم تو دعا بھی نہیں مانگنے دیتے ہو۔‘‘ ’’تو رونے کی کیا بات ہے۔ ہم سے تو کہتی ہیں رونے سے آنکھیں خراب ہوجاتی ہیں۔‘‘

یا اللہ میں کیا کروں خیالات آنسوؤں کے سیلاب میں غوطہ زن ہونے گئے چہرہ آنچل سے پونچھا ادھر ادھر دیکھا کوئی بھی نہیں تھا۔ جائے نماز تہہ کردی لیکن خوشی کی ایک لہر جو شاید غیر ارادی تھی دماغ سے ٹکرائی ’’کتنے اچھے ہیں میرے پارٹنرز ...... مجھے کچھ سوچنے ہی نہیں دیتے۔ اداس ہونے دیتے ہیں نہ رونے دیتے ہیں۔ مال اور اولاد فتنہ بھی تو ہیں۔ ان کی کیسی فتنہ گیری ہے یہ...... کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی سب موجود ہیں......میرے اردگرد، میرے حواس پر......!

☆......☆......☆

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

شادی دستک

مِس رضوانہ کے ریٹائر ہونے کے دن قریب آرہے تھے۔ اس نے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں نہایت ایمانداری، محنت، حوصلے سے ملازمت کی تھی۔ اسے ہر پرنسپل کا اعتماد حاصل رہا بلکہ وہ ان کی دست راست رہی اور طالبات کی بہترین استاد، مشیر اور دوست...... جس طالبہ کو مسئلہ پیش آتا اس کو مس رضوانہ یاد آجاتیں۔

زندگی اتنی سبک سہل آسان مطمئن...... جیسے نئی ہنڈا کار موٹر وے پر دوڑ رہی ہو۔ ٹینکی پٹرول سے فل ہو اور اسے ڈرائیور چلا رہا ہو۔ عبادات، معاملات، خدمات...... رزق حلال...... کام میں کمال اور نیکی میں ہم خیال یہی اس کا زادِ راہ تھا۔

چھوٹا سا شہر تھا۔ سب جانتے تھے۔ اب مشکل یہ آ پڑی کہ ملازمت ختم ہونے کے بعد وقت کیسے گزرے گا۔ 35 سال کی روٹین تو گوڈوں گٹوں میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے یہ ذکر اپنے مجازی خدا سلیم کا نجو کے ساتھ چھیڑ دیا۔

''میں سوچتی ہوں میں فارغ ہو کر کیا کروں گی......؟''

وہ ہنس کر بولے ''سو کاموں کا ایک کام...... محلے کی عورتوں کو ساتھ ملا لو اور چغلی میٹنگ شروع کردو۔ بہتوں کا بھلا ہوگا۔''

''ہائے ہائے یہ کیا بات ہوئی......کوئی مشورہ دیں۔''

''گھر پر ٹیوشن سنٹر یا اکیڈمی کھول لو۔ پانچوں گھی میں سر کڑاہی میں۔''

میں تو ساری زندگی ٹیوشن کے خلاف رہی ہوں کہ سکول میں ہی محنت کراؤ بچے دوبارہ کیوں فیس بھریں۔ اب مجھے شرم نہ آئے گی کہ اپنے ہی کہے کی نفی کردوں۔''

''سیاست دانوں سے کچھ بھی نہ سیکھا۔''

''میں نے کون سی دکان چمکانی تھی۔''

''پھر بوتیک کھول لو......''

''ساری زندگی علم تقسیم کیا اور اب یہ حقیر کام ......نہ میں نہیں کرسکتی۔ استاد کی تو بڑی عزت ہوتی ہے۔''

''تو اب اس عزت کو کیش کراؤ نا...... خالی خولی عزت کا بت بنا کر اس کی پوجا کرنی ہے؟ آج کل سب کچھ پیسہ ہے پیسہ......عزت کو کون پوچھتا ہے جس کے پاس مال و دولت ہو وہ عزت بھی خرید لیتا ہے اور کرسی بھی......''

''نہیں یہ مجھے پسند نہیں۔''

''پھر الیکشن لڑ لو...... دیکھیں گے تمہاری عزت اور نیک شہرت تمہیں کتنے ووٹ دلواتی ہے۔ پھر قوم کی خدمت کرو۔'' وہ خاموش ہو گئی۔ سلیم صاحب سمجھے میرا تیر کارگر ہوا اور نشانے پر لگا۔ وہ دو سال پہلے ہی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور ابھی تک گومگو کا شکار تھے کہ کیا کروں۔

''اچھا بھئی میری بات تم نے کہاں پسند کرنی ہے۔ اپنے پیرو مرشد سے مشورہ لے لو۔ دیکھو زنجانی صاحب کیا کہتے ہیں۔''

''پر کوئی ایسا کام ہو کہ آپ بھی مصروف ہو جائیں۔''

''نہ بیگم صاحبہ ہم مزے میں ہیں۔ سیر کرتے ہیں۔ اخبار پڑھتے ہیں دوستوں کے ساتھ گپ شپ اور لڈو کھیلتے ہیں۔ ساری عمر کام ہی کیا ہے۔ اب یہ آرام کے دن ہیں آپ بھی چند دن گھر بیٹھیں گی تو اس عیاشی کی قدر کریں گی۔''

وہ اتوار کے روز پروفیسر نیک نام زنجانی کے گھر گئی وہ چوں چوں کا مربہ تھے۔ یہ تو کسی کو علم نہ تھا کہ وہ پروفیسر کیسے بنے۔ کس یونیورسٹی سے پڑھا تھا۔ لیکن دانش، علم نجوم، رمل، علم جفر اور نہ جانے کون کونسے علم انہوں نے پڑھ رکھے تھے۔ ان کیلئے بھلا کون سی ڈگری کی ضرورت ہوتی ہے۔ انارکلی

میں جمعے والے دن شام کو پرانی کتابوں کا جمعہ بازار لگتا ہے۔ زمین پر چادر بچھا کر اس پر پرانی کتابوں اور رسالوں کے انبار ہوتے ہیں وہاں سے ''نسخہ ہائے وفا'' اٹھا لاتے تھے۔ شہرت دور تک تھی۔ لوگ آتے فیض پاتے اور حسبِ توفیق ''نذرانہ'' دے جاتے۔ دوسرے دن رضوانہ سلیم ان کے گھر جا پہنچی۔ ہمسائے بھی تھے اور ان کی بیٹیاں ان کی شاگرد تھیں۔ چنانچہ خوب آؤ بھگت ہوئی چائے کے ساتھ میٹھی گڑ کی ٹکیاں جوان کی بیوی نے بنائی تھیں وہ کھانے کو ملیں۔ اب رضوانہ نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ پروفیسر صاحب نے اپنی عینک درست کی۔ ایک منٹ تک غور و فکر کیا اور سوچ کی وادی سے دانش کا موتی ڈھونڈ لائے۔

''آپ رشتے کروانے کا ادارہ کھول لیں۔ ہمارا شہر اس معاملے میں خود کفیل نہیں ہے۔ شہروں میں تو میرج بیورو ہوتے ہیں لیکن وہ چالاک لوگ سیدھے سادے ضرورت مندوں کو چونا لگا جاتے ہیں۔ ماشاءاللہ آپ کو سارا شہر جانتا ہے بلکہ آپ کو تو لڑکیوں کے بارے میں بھی علم ہے کہ وہ آپ کی شاگرد رہی ہیں۔''

''بعد میں اگر شادی نہ نبھ سکی تو ہم پر الزام تو نہیں آئے گا۔''

''دیکھیں مس صاحبہ یہ تو نصیبوں کی بات ہے۔ والدین کی پہلی پریشانی کہ اولاد ہو جائے بیٹا ہو جائے۔ دوسری پریشانی اب اچھی تعلیم اور نوکری مل جائے۔ اس کے بعد رشتے کی تلاش شروع ...... جوتیاں گھس جاتی ہیں اور اچھا رشتہ نہیں ملتا۔''

''اچھا پروفیسر صاحب مشورے کا شکریہ میں سوچوں گی۔''

''یہ کام صرف آپ ہی کر سکتی ہیں کہ آپ کی نیک نامی رشتے کی ضمانت بن جائے گی۔ اس طرح بہت بڑی خدمت خلق انجام دے سکیں گی۔ اگر شادیاں وقت پر ہو جائیں تو بے راہ روی کم ہو سکتی ہے۔ حکومت کو اپنے کاموں سے فرصت نہیں ملتی ادھر کون توجہ دے۔ ہماری بچیاں بھی آپ کی طالبات رہی ہیں۔ تینوں شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں ان کا بھی خیال رکھیے گا۔''

''جی جی ضرور کیوں نہیں ......اچھا جی خدا حافظ۔'' گھر آ کر سلیم کو بتایا۔

انہوں نے کہا ''ہاں کاروبار تو اچھا ہے لیکن اس متوسط طبقے کے شہر میں زیادہ فیس نہیں ملے گی۔''

''ہمیں پیسوں کی پروا نہیں ہے بس مصروفیت ہو، نیک کام ہو، اور خدمت خلق ہو، پیسہ بہت کما لیا اب تو گزارا ہی کرنا ہے جو ہو رہا ہے تو اور نیکی کما لیں۔''

جس دن مس ضوانہ کی الوداعی پارٹی تھی سب نے پوچھا کہ اب آپ کا کیا ارادہ ہے ذرا مائیک پر آ کر جواب دیں۔ انہوں نے کہا پہلے تو میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ ملازمت کا عرصہ اچھے طریقے سے تکمیل کو پہنچا اور یہ ادارہ جو میرا دوسرا گھر تھا۔ اس سے آج عزت سے رخصت ہو رہی ہوں۔ آپ کے تعاون کا شکریہ۔ آپ سب بہت یاد آئیں گی آگے کیلئے ابھی تو کچھ نہیں سوچا بس مشورے ہی مل رہے ہیں کیونکہ کام کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ بیکار تو نہیں رہا جا سکتا۔

''شادی دستک'' کھولنے کا ارادہ کیا ہے۔ تجربہ تو نہیں ہے لیکن واقفیت بہت ہے۔ امید ہے کہ اب اس میدان میں بھی ہم کوئی معرکہ مار سکیں گے۔ آپ سب لوگوں سے درخواست ہے کہ اپنے بچوں کی شادیوں کیلئے یعنی رشتے کی تلاش کیلئے ہم سے رجوع فرمائیں۔ ویسے خاندان میں رشتے موجود ہوں تو ان کو ترجیح دیں کیونکہ اس طرح خاندان مضبوط ہوتے ہیں اور بہت سارے تکلفات سے بندہ بچ جاتا ہے۔

ایک ٹیچر نے نعرہ لگایا، نہ جی آج کل تو لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اللہ خاندان والوں سے بچائے۔ طعنے دے دے کر ناک میں دم کر دیتے ہیں اگلے پچھلے بدلے لینے یاد آتے ہیں۔ ایک اور نے جواب دیا، مس رضوانہ اب آپ کا کاروبار خوب چلے گا اور دعوتیں بھی خوب ہوں گی۔ بس جی اللہ پر توکل ہے کہ جو زندگی باقی ہے وہ اپنی مخلوق کیلئے کوئی کام لے لے۔

دوسرے دن سے ہی فون آنے شروع ہو گئے۔ سکول میں بات ہوئی تھی۔ گویا ''میڈیا'' بہت ایکٹو تھا۔ لڑکیوں نے مائیوں نے، ٹیچروں نے گھر جا کر بات کی۔ یوں مس رضوانہ کا ایڈورٹائزنگ کا خرچہ بچ گیا۔ ایک کرنل صاحب کی بیوی کا فون آیا۔ ان کو اپنے کیپٹن بیٹے زاہد جلال کیلئے خوبصورت شائل لڑکی کا رشتہ چاہیے تھا۔ قد 5 فٹ چار انچ، رنگ گورا، آنکھیں سیاہ، بال لمبے، اچھا خاندان ہائی لی ایجوکیٹڈ، میرا بیٹا 5 فٹ 8

انچ ہے، قد چھوٹا نہ ہو خاندان بڑا نہ ہو، شریف لوگ ہوں، دولت مند بھی ہوں تو کیا بات ہے۔

''دیکھیں......صورتیں تو اللہ جی بنانے والے ہیں۔ ویسے میک اپ کر کے دلہن بن کے تو ہر لڑکی پر روپ آ ہی جاتا ہے بعد میں شکل کون دیکھتا ہے۔'' انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہ جی ...... بعد میں آنے والی نسلیں خوبصورت ہوتی ہیں۔ سارے معاملات دیکھنے پڑتے ہیں۔''

انہوں نے دو رشتے بتائے ایک پروفیسر زنجانی کی بیٹی ایمن کا اور دوسرا اپنی شاگرد رفیعہ کی بڑی بہن بازغہ کا جو ابھی ابھی پنجاب یونیورسٹی سے سوشل ورک میں ایم اے کر کے آئی تھی۔

انہوں نے ایمن کو فوراً ہی ریجکٹ کر دیا۔ بولیں۔''اس کے باپ کی شہرت اچھی نہیں ہے نہ ہی وہ ہماری ٹکر کا خاندان ہے البتہ بازغہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ ان سے بات کر کے ہمیں پتہ فون نمبر اور وقت بتا دیں۔''

''اچھا ٹھہریں میں ڈائری پہ آپ کے بیٹے زاہد جمال کا ڈیٹا لکھ لوں۔ آپ اپنا نمبر بھی دیدیں میں دو تین دن بعد فون کرونگی انشاءاللہ۔''

تین دن بعد ان کا فون دوبارہ آ گیا۔

''جی کیا بنا رشتے کا......؟''

''بس میں آپ کو فون کرنے ہی والی تھی۔ کل اتوار ہے آپ بعد دوپہر چار بجے کے قریب چلی جائیں۔ گلشن غالب میں ان کا گھر ہے۔ 34-A نمبر ہے۔''

''آپ ساتھ نہیں چلیں گی؟ ہم تو ان کو بالکل نہیں جانتے۔''

''لیکن میں نے آپ کا تعارف کرا دیا ہے کل میرے مہمان آ رہے ہیں مجھے معاف ہی رکھیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔''

اتوار کی شام کو جو مہمان آ رہے تھے وہ ان کی نند کے رشتے دار تھے ان کی آمد کے بعد پتہ چلا کہ انہیں بیٹے اور بیٹی دونوں کیلئے فوری رشتہ درکار ہے۔ بیٹی نے بی اے پاس کر لیا ہے اور بیٹے نے میٹرک کے بعد کپڑے کی دکان کھول لی ہے۔ خاوند سعودیہ میں ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دونوں بچوں کی جلد از جلد شادیاں کر کے یہاں آ جاؤ۔ میں اکیلا ہوں۔ بہت تنہائی برداشت کر لی۔ انہوں نے کہا مجھے ارجنٹ رشتہ چاہیے۔ فیس بتا دیں، ڈبل دینے کو تیار ہیں لیکن بس اسی ماہ میں شادیاں ہو جائیں۔

مس رضوانہ دھک رہ گئیں ارجنٹ رشتے کی اصطلاح خوب لگی بھئی اکیسویں صدی ہے کیوں نہ ہو۔ بیٹے کیلئے انہوں نے پھر پروفیسر صاحب کی بیٹی ایمن کا رشتہ بتایا اور بیٹی کیلئے سوچ میں پڑ گئیں کہ اگر زاہد جمال کا وہاں نہ ہوا تو پھر آمنہ کا بتا دوں گی۔ گویا ہوئیں۔

''بیٹی کیلئے تو ابھی کوئی رشتہ نظر میں نہیں ہے لیکن آپ فکر نہ کریں کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔''

''میں تو بڑی آس لے کر آئی تھی صنوبر نے جواب دیا۔'' اچھا جلدی کیجیئے گا مجھے جلدی ہے۔'' دوسرے دن بیگم کرنل کا فون آ گیا۔

''لڑکی تو اچھی ہے مگر اس کی ماں بولتی کم ہے اور گھر کا رہن سہن بھی ہمارے برابر نہیں ہے۔''

''آپ نے لڑکی سے شادی کرنی ہے اس کی ماں کو چھوڑیں۔ لڑکی پسند ہے تو ہاں کر دیں۔ رہن سہن جیسا آپ کا ہو گا وہ اسی ماحول میں ڈھل جائے گی۔''

لڑکی تو خوبصورت ہے نا لمبے بال۔ لمبا قد۔ اور پڑھی لکھی بھی ہے''

''ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن انہوں نے زاہد کی تصویر مانگی ہے۔''

''تو دکھا دیں......وردی والی تصویر دکھا دیں۔''

''مگر میرا بیٹا ذرا سانولا ہے اور اس کا قد بھی چھوٹا ہے ذرا موٹا بھی ہے۔''

''اچھا آرمی والے تو موٹا نہیں ہونے دیتے۔ کوئی بات نہیں...... جو ہو گا دیکھی جائے گی۔''

''اب پہلی ہی لڑکی کو کیسے پسند کر لوں دو تین اور دکھائیں ذرا چوائس ہونی چاہیے۔ دیکھیں نہ مس رضوانہ آپ بازار جاتے ہیں تو پہلی دکان پہ جو پہلا کپڑا دکاندار دکھاتا ہے ہم وہ تھوڑی لے لیتے ہیں وہ تو دکھاتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ڈھیر لگا دیتا ہے۔ لیکن ہمیں پسند نہ آئے تو ہم خریدے بغیر لوٹ آتے ہیں۔''

''معاف کیجئے گا مسز کرنل...... انسان اور کپڑے میں فرق ہوتا ہے جب آپ کسی کو بغیر وجہ کے مسترد کریں گی تو کل کوئی آپ کو انکار کر دے گا۔''

''آپ تو ناراض ہی ہوگئیں...... کوئی اور لڑکی بتائیں۔'' اب انہوں نے آمنہ کا رشتہ بتایا۔ ایک ہفتے بعد ''باز غہ'' کی امی کا فون آ گیا۔

''السلام علیکم مس رضوانہ آپ کیسی ہیں۔ رشتہ بھجوانے کا بہت بہت شکریہ۔ وہ کرنل صاحب کی بیگم یہاں سے تو بہت خوش گئی تھیں لیکن اتنے دن ہو گئے پھر ان کا فون نہیں آیا۔ ذرا آپ پتہ کر دیں ان کا کیا ارادہ ہے۔'' اب رضوانہ ٹھہریں وضع دار...... انہیں شرم دامنگیر ہوئی کہ ان کا دل کیسے توڑیں جھوٹ کیسے بولیں......؟

کیا کریں بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اور جو چاہیں کہ چھپا لیں تو چھپائے نہ بنے

''آپ ان کے گھر کا چکر لگا لیں۔ لڑکے کو بھی دیکھ لیں پھر مرد حضرات آپس میں مل لیں۔ یہ ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ صرف ایک ملاقات سے طے نہیں ہوسکتا۔ لیکن انہوں نے تو ہمیں گھر آنے کی دعوت ہی نہیں دی۔''

''آپ خود فون کر کے بتا دیں کہ اگلی اتوار کو آپ آنا چاہتی ہیں۔''

''مجھے تو شرم آتی ہے آپ ہمارے ساتھ چلیں۔''

''میں ویسے بھی اکیلی ہوں اور میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ سب کے ساتھ جا سکوں میں صرف رابطہ کروا سکتی ہوں آپ خود وقت لے لیں۔''

''اچھا جی جیسے آپ کی مرضی...... السلام علیکم''

رضوانہ سوچ میں پڑ گئی کہ ہر کسی کے ساتھ جانا تو بہت مشکل ہے کیا بنے گا۔ اسی وقت مسز کرنل کا فون آ گیا۔

''آپ نے جن لڑکیوں کے رشتے بتائے تھے ایک کا تو قد چھوٹا ہے دوسری کا قد تو ٹھیک ہے ناک بہت اونچی ہے یوں لگتا ہے جیسے نقلی ناک لگی ہو ہمیں نہیں پسند کوئی اور بتائیں۔''

''توبہ توبہ...... کیا کہہ رہی ہیں آپ اللہ سے ڈریں یہ انسان اس کی تخلیق ہے جو احسن الخالقین ہے اس میں انسان کا کیا اختیار؟''

''لیکن ہمیں یہ تو اختیار ہے کہ اپنی مرضی کی لڑکی سے شادی کریں جو پسند ہو۔''

''میں معذرت خواہ ہوں مسز کرنل...... آپ کے معیار تو عرش پر ہیں اور یہ سب لڑکیاں فرش پر ہیں۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ آپ کوئی اور در دیکھیں آپ جس چودھویں کے چاند کی تلاش میں ہیں وہ اس شہر میں تو ملنی مشکل ہے۔''

''مس رضوانہ آپ تو بالکل ہی ناراض ہوگئی ہیں پلیز رشتے بتاتی رہیں کوئی نہ کوئی تو مل جائے گی۔''

''اچھا میں پھر بات کروں گی۔''

اگلے دن لاہور سے ان کی دوست راشدہ جمیل کا فون آ گیا۔

''واہ رضوانہ تم تو چھپی رستم نکلیں۔ شادی دستک کھول لیا ہمیں خبر تک نہ دی۔''

''لیکن تمہیں خبر کیسے ملی...... کسی ٹی وی چینل پر تو نشر نہیں ہوئی؟''

''دیکھ لو...... کسی فرشتے نے ہمیں بھی بتا دیا اچھا دیکھو تمہیں تو معلوم ہے کہ میری صرف چار بیٹیاں ہیں اور اب سب شادی کی عمر میں ہیں۔''

''تو یوں کہو...... کہ تمہیں بھی کام پڑ گیا مجھ سے ورنہ تو فون کئے ہوئے سمے بیت گئے۔''

''ویسے رشتے دو تین باہر کے تو ہیں ایک لڑکا امریکہ میں ہے ڈاکٹر ہے عمر ذرا زیادہ ہے 35 سال کا ہے۔ دوسرا جرمنی میں ہے سنا ہے کسی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے لیکن باہر کے رشتوں کی تصدیق کون کرے۔ دھوکے سے ڈر لگتا ہے اس لئے ابھی ہاں نہیں کی۔ اگر پاکستان میں ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ بڑی بیٹی وردہ کی عمر 27 سال ہے۔ ایم فل کر رہی ہے۔ نرسری سے لے کر ایم اے تک اس نے ہمیشہ فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ بہترین اتھلیٹ رہی ہے۔ ڈی بیٹ میں ہمیشہ انعام لے کر آتی رہی ہے۔ سکول اور کالج میں یونین کی صدر رہ چکی ہے۔ اللہ کا شکر ہے میری بیٹیاں بہت خوبصورت ہیں فیشن ایبل ہیں کانونٹ کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ماڈرن زمانے کے فیشن اور پروٹوکال ان سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ وردہ جاب بھی کر رہی ہے ساٹھ ہزار اس کی تنخواہ ہے کمپنی نے گاڑی دی ہوئی ہے۔ چار پانچ ٹور ہانگ کانگ، سنگاپور، سوئٹزرلینڈ

اور برطانیہ کے بھی لگا آئی ہے۔اب اس کی شادی ہو جانی چاہیے اسے تو جلدی نہیں ہے لیکن ہم پریشان ہیں۔''

''ہیلو کال تو نہیں کٹ گئی۔سن رہی ہو ناں......''

''تم سانس لینے کو رکو تو میں بولوں تم نے تو میری بولتی بند کر دی ہے۔اس کیلئے تو کوئی بزنس ٹائی کون ہونا چاہیے۔ ہاں ایک کرنل کا بیٹا ہے زاہد جمال ابھی تو میجر ہے لیکن ظاہر ہے ترقی ہو گی تو چیف تک جا سکتا ہے بلکہ ملک کا صدر بھی بن سکتا ہے۔''

''ہائے ہائے اللہ رحم کرے، ہمارے وطن پر ایسی بدفال منہ نہ نکالو۔''

''اچھا میں انہیں بتاؤں گی۔اب اللہ حافظ۔''

رضوانہ نے فون کر کے جتنی تقریر زبانی یاد تھی مسز کرنل کو سنا دی۔ وہ خوش ہو گئیں۔''ایسی لڑکی چاہیے تھی دیکھیں یہ لعل بدخشاں آپ نے پہلے کیوں نہ دکھایا۔''

''چلیں اب دیکھ لیں کونسی دیر ہو گئی ہے یہ لیں نمبر لاہور جائیں پہلے وقت لے لیں۔ بیٹے کو ساتھ لے جائیں روز روز جانا کونسا آسان ہے۔ہاں آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بہت بہت شکریہ۔''

شام کو کرنل صاحب گھر آئے تو بیگم نے بتایا''مبارک ہو لڑکی مل گئی ہے۔''

''اچھا...... وہ حیران ہو کر بولے اور تمہیں پسند بھی آ گئی......؟ کمال ہے۔''

''نہیں ابھی دیکھی کہاں ہے لیکن ہیرا ہے ہیرا میرے بیٹے کی تو لاٹری نکل آئے گی۔'' ساری تفصیلات گوش گزار کر کے انہوں نے فخر سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا وہ بولے۔''لڑکی کا خاندان کیسا ہے، عقائد کیا ہیں۔نماز پڑھتی ہے؟ گھر کا سلیقہ کتنا ہے،عورت نے گھر چلانا اور بچوں کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔''

آپ فوج میں ہو کر کتنی دقیانوسی باتیں کر رہے ہیں ہمارے آگے پیچھے نوکر ہیں وہ کیوں کام کرے گی بس ہم اس اتوار کو لاہور جا رہے ہیں۔''

ڈیفنس میں چار کنال کا بنگلہ، تین گاڑیاں، ٹویوٹا، بی ایم ڈبلیو اور ہونڈا کھڑی تھیں۔ آگے پیچھے نوکر تھے۔ مسز کرنل تو ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ ملاقات ہوئی وردہ ابھی دفتر سے نہیں آئی تھی۔ خورد و نوش سے فراغت ہو چکی رات کے نو بج گئے لڑکی نہ آئی۔ ماں نے بار بار فون کر کے کہا اس نے بتایا کہ چائنا سے ڈیلی گیٹ آیا ہوا ہے ان کے ساتھ ڈنر ہے آپ مہمانوں کو لے کر ہوٹل آ جائیں۔ ہوٹل گئے ایک الگ ٹیبل پر بیٹھے، ڈنر بھی آ گیا وردہ جو کوٹ اور پینٹ اور گلے میں ایک مفلر تھا میں ملبوس تھی 5 منٹ کیلئے آئی ہیلو ہائے کیا، لڑکے سے ہاتھ ملایا اور معذرت کر کے چلی گئی۔مسز کرنل کے ارمانوں پہ تھوڑی سی اوس پڑ گئی تھی۔ واپسی پر وہ چپ چپ تھیں۔ کرنل صاحب بولے۔

''بیگم لڑکی کیسی لگی، پسند آئی، کب تک جواب دیں گے۔''

''آپ کو کیسی لگی؟'' وہ دھیرے سے منمنائی۔

''بڑی ماڈرن، کون فیڈ ڈیشنگ ...... بہت اچھی لگی زاہد کو ایسی ہی لڑکی کی ضرورت ہے۔''

''اچھا لیکن بہت ہی زیادہ ماڈرن ہے......؟''

''جب شادی ہو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''بیٹے تمہیں لڑکی پسند آئی۔''

''ہاں ڈیڈی......فوج میں تو بیوی کو ایسا ہی ہونا چاہیے تاکہ کلب کی صدر بن سکے، تقریر کر کے دوسروں کو متاثر کر سکے، سوسائٹی میں موو کر سکے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''بھئی ان کا شکریہ ادا کرنا جنہوں نے یہ رشتہ بتایا ہے۔'' پہلے تو مسز کرنل ان کے فون کا انتظار کرتی رہی ہفتے بعد فون کیا تو وردہ کی امی بولی۔

''میری بیٹی کو آپ کا لڑکا پسند نہیں آیا۔ وہ بولڈ نہیں ہے۔'' انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ میاں بیوی میں سے ایک کو ہی بولڈ ہونا چاہیے۔

''ہاں مسز کرنل مگر دو تین اور رشتے بھی زیرِ غور ہیں۔ اس لئے ہماری طرف سے ''نہ'' ہی سمجھیں۔

مسز کرنل ہیلو ہیلو کرتی رہ گئیں فون بند ہو گیا۔ سونے کی چڑیا نے صرف ایک ہی جھلک دکھائی اور پھر سے اڑ کر دوسری ڈالی پر جا بیٹھی۔

☆......☆......☆

قانتہ رابعہ

ہتھیار

''خوشبو میں بسے لوگو، کیوں اتنا ظلم کرتے ہو۔'' ناعمہ کا قلم تیزی سے لکھنے میں مصروف تھا کہ اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور ساتھ ہی زوردار قہقہے کی آواز۔

''ہاہاہا...... یہ تو شعر ہو گیا۔ خوشبو میں بسے لوگو، کیوں اتنا ظلم کرتے ہو، واہ......واہ......مکرر ارشاد......کیا کہنے......''

''اسید کے بچے......'' ناعمہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''استغفر اللہ ربی......استغفر اللہ......'' اسید نے کانوں کو ہاتھ لگائے، گناہگار ضرور ہوں پر شادی سے پہلے ہی بچے......توبہ توبہ، کمال درجے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''اوسید......پلیز گیٹ آؤٹ......'' ناعمہ نے اپنے لکھے ہوئے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ا...... و...... ہ'' اسید نے سیٹی بجائی...... ''پلیز بھی اور گیٹ آؤٹ بھی......کیا۔ حسن ترتیب ہے......گالی اور دعا ایک ساتھ جیسے کوئی کہے، اوئے الو کے پٹھے ہمیشہ خوش رہو۔''

''حسن ترتیب کے بچے'' ناعمہ نے پھر دانت کچکچائے۔

''ماں باپ کا نام ہی بدل ڈالا لو جی کر لو گل کبھی میرے بچے بنا دیئے اور کبھی امی ابو کا نام ہی حسن ترتیب قرار دے دیا۔ یعنی ابا حُسن ہی حسن امی سراپا ترتیب......ویسے بائی داوے یہ کیا لکھا جا رہا ہے؟'' اس نے جھپٹنے والے انداز میں کاغذ قابو کیا۔

''ناعمہ...... یہ کیا لکھا ہے ناعمہ نمکین......کیا ناعمہ نمکین ہوتی ہے؟ ہمیں تو ناعمہ شیریں، شیریں سی لگتی تھی......'' اسید نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

''میں کالج کی ڈرامیٹک کلب کی ممبر منتخب ہوئی ہوں ناں میگزین کے لئے آرٹیکل لکھ رہی تھی۔'' ناعمہ نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا ''اور ناعمہ نمکین نہیں ناعمہ تمکین ہے، تمکین......سمجھے۔''

او......ہ...... ہماری بہن تو ادیبہ بن گئی ہے، زبردست۔ واہ بھئی واہ! خواتین متوجہ ہوں دنیائے ادب کا ایک روشن ستارہ آفاق ہاؤس میں نمودار ہوا ہے۔'' اس نے اعلان کرنے کے سے انداز میں کمرے سے باہر کے لوگوں کو مخاطب کیا۔

''ہاں بالکل......تمہیں اعتراض ہے کوئی۔'' ناعمہ نے اپنے سے بڑے بھائی کے لئے تمام ادب آداب ایک طرف پھینک دیئے۔ ویسے بھی دو سال تو بڑا تھا۔'' اور دادا ابا کہا کرتے تھے بزرگی بہ عمر نیست''

''یعنی کہ تم دنیائے ادب کا روشن ستارہ ہو......دمدار ستارہ......''

اسید یہ کہہ کر تیزی سے باہر کی طرف بھاگا، اسے پتہ تھا اس کا استقبال اب سٹائلو یا ہش پپیز کے کسی ہیل والے میزائل سے ہوگا۔ ایسے ہی ہوا، اس نے قریب رکھا جوتا جونہی اٹھا کے اسید کو مارا......ساتھ ہی ابا اندر داخل ہوئے اور ''ہائے میرے اللہ......کون الو کا پٹھا ہے یہ......'' کہہ کر دروازے پر ڈھیر ہو گئے۔

جونہی جوتا، ابا میاں کو لگتے دیکھا ناعمہ کے طوطے طوطیاں سب اڑ گئے۔

''ابا، وہ......میں......'' اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے......

ہیل ابا کی لمبی چوڑی پیشانی پر لگی تھی اور اپنا نشان بھی'' تاکہ سند رہے، کے طور پر ثبت کر چکی تھی۔ پہلے تو ابا کا جلال مشہور تھا اب ساتھ گرج چمک بھی کبھی پیشانی سہلاتے کبھی ہائے ہائے کا ورد کرنے لگ جاتے......ہمت کر کے ناعمہ آگے بڑھی اور ریک سے آیوڈیکس نکالی......ابا کے ماتھے پر پلپلے آلو کی طرح بڑا سا گومڑ بنا ہوا تھا......

''اب......با......یہ......لگا دوں'' ناعمہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''رہنے دو......لگاؤ......اس مردود لعین کے......'' غصے میں انہوں نے اسید کا نام تک نہ لیا۔ امی کو پتنگے لگ گئے......''میر صاحب سوچ سمجھ

کے بات منہ سے نکالا کریں۔''

''تم ......تم اور سر پر چڑھاؤ اس خبیث کے بچے کو......'' ابو کے منہ سے لفظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کے نکل رہے تھے۔ ''تم انہیں بجائے روکنے کے شہہ دیتی ہو۔''

امی خاموش رہیں......ابا کو خاموش بندوں سے ویسے ہی الرجی ہوتی تھی پھر گرجے ''کان کھول کر سن لو، آئندہ اس چندے آفتاب چندے ماہتاب نے ایسے کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' آیوڈیکس والی پیکنگ انہوں نے زور سے پٹخی۔

''بالکل ٹھیک ہے......ایسے ہی ہوگا......'' ان کی نظر آیوڈیکس کی ٹوٹی شیشی پر تھی۔

''یعنی مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا کیا تم نے؟'' ابو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کچھ دیر سوچتے پھر فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ کمرے کے گھٹن والے ماحول میں ان کا چھت پھاڑ قہقہہ اوپرا اوپرا سا لگ رہا تھا۔لیکن سب سے پہلے ان کے قہقہے کا ساتھ امی نے دیا۔ آہستہ آہستہ ناعمہ، اسید، نمرہ کے چہروں پر بھی مسکراہٹ آ گئی...... چند لمحوں میں گرما گرم چائے اور بسکٹ بھی پیش کر لیے گئے...... ماحول ایسا ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو......ایک دم ناعمہ نے کہا۔ ''اللہ کا شکر ہے بہت بڑا ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا ہے......'' ابو نے گھور کر اسے دیکھا۔

اسید بولا...... ''کیا بات ہے جب بھی ہمارے ہاں اس قسم کی شیطانی گہما گہمی کا دور چلنے لگتا ہے اچانک ہی غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے اور ڈراپ سین بغیر کسی بڑے نقصان کے ہو جاتا ہے۔'' ابو نے گھوریوں کا رخ اسید کی طرف کرلیا۔

نمرہ نے اٹھ کر ابا کے گلے میں بازو ڈالے...... ''حالانکہ ابا کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ دو چار برتن شہید ہو جائیں، دو چار تھپڑ بھی لگا دیئے جائیں...... ہے ناں ابا''

ابا میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

''سپاہی مورچہ چھوڑ گیا......'' اسید نے نعرہ لگایا......

''کیوں امی آپ بتائیں ناں بڑی جنگ ہوتے ہوتے کیوں رہ جاتی ہے؟''

کچھ دیر تو امی ہونٹوں پر پراسرار سی مسکراہٹ سجا کر بیٹھی رہیں پھر آہستہ آہستہ بولیں۔

''اس کا حل تو چودہ سو سال سے زائد عرصہ قبل میرے نبی محترم نے دے دیا تھا......'' وہ کیا ناعمہ اور اسید اکٹھے بولے اور چونک کر سیدھے ہوئے۔

''وہ یہ کہ آپؐ نے ایک دفعہ ایک صحابی سے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر تم صبح کی اور مغرب کی نماز کے بعد سات سات دفعہ سورۃ توبہ کی آخری آیت پڑھ لیا کرو تو تمہارا مال تمہاری جان، اولاد، گھر بار سب کچھ اللہ رب العزت کے حفظ و امان میں رہے گا......صحابہ کرامؓ نے اس کے بعد بارہا آزمایا۔کبھی آگ چاروں طرف پھیلی اور پڑھنے والے کی چوکھٹ پر آ کر بجھ گئی۔کبھی نقصان کی خبر آئی مگر بعد میں غلط ثابت ہوئی۔ الغرض میں بھی اس اللہ کے سچے کلام اور اس کے محبوب کی سچی بات سے مدد لیتی ہوں۔ یہ آیت پڑھ کر انؐ کی طرح میں بھی اپنے اور اپنی آل اولاد کے سارے معاملات اپنے رب کے سپرد کر دیتی ہوں۔ پھر جو وہ کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔''

''مگر ابو کے ماتھے پر بغیر کسی وجہ کے چوٹ......'' اسید پریشان ہو کر بولا......وہ...... بات......یہ ہے۔'' امی نے ٹھنڈا سانس لیا......'' دنیا میں اگر مسلمان کو ایک کانٹا چبھنے جتنی بھی تکلیف ہوتی ہے تو وہ یا تو اس کے اس دن کے کسی ناگوار عمل کی معافی کا ذریعہ ہوتی ہے یا پھر اس کا اس مصیبت پر صبر کرنے سے اجر کا باعث بنتی ہے، درجہ بڑھاتی ہے......'' امی نے ہچکچاتے ہوئے بات مکمل کی۔

''اب یہ اللہ پر ہے یا آپ کے ابا پر کہ یہ کسی گناہ کا کفارہ تھی یا اجر بڑھانے کے لئے آزمائش...... یہ فیصلہ میرے اور آپ کے کرنے کا نہیں ہے......''

امی نے کمرے سے نکلتے ہوئے انہیں بھی باہر آنے کا اشارہ کیا جہاں بہت سے کام ان سب کے منتظر تھے۔

☆......☆......☆

عائشہ ضمیر صدیقہ

گِدھ

ہسپتال کے صاف شفاف برآمدے میں سے گزر کر جب میں بڑے ڈاکٹر کے کمرے کے سامنے پڑے ہوئے بینچ پر بیٹھنے لگی تو ایک نظر اپنے اردگرد ڈالی۔قریب ہی دو عورتیں آپس میں سرگوشی میں مصروف تھیں سامنے والی تینوں ادھیڑ عمر عورتیں کسی پڑوس کی لڑا کا عورت کی گفتگو کر رہی تھیں، جو آج صبح ہی صبح ان کے گھر کے سامنے کوڑا ڈال گئی تھی۔ چوتھی اپنے نحیف ونزار بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔تیسری بینچ پر جو عورتیں تھیں وہ خاموش تھیں۔کبھی کبھی نظر اٹھا کر ڈاکٹر کے دروازے کی طرف دیکھ لیتی تھیں پھر ایک دوسرے کے چہرے کو تکنے لگتیں جیسے وہ چہروں سے دلی کیفیت جاننا چاہتی ہوں۔ یا پھر وہ صرف اپنے نمبر آنے کے انتظار میں بول کر خلل ڈالنا نہ چاہتی ہوں۔یوں سب کے چہرے خشک اور مرجھائے ہوئے تھے۔ جیسے باسی پھول بے رنگ بے بو۔

میرا ذہن خالی اور کسی حد تک پُرسکون تھا۔کسی قسم کا خوف تر دد یا ریحان میرے اندر نہ تھا۔میں باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں ننھے منے رنگ برنگے پھول اور مہندی کی باڑ لگی تھی۔ڈاکٹر کی کار کے قریب ایک سفید بالوں والا چھوٹا کتا کھڑا تھا۔

گھنٹی بجی اور سفید ساڑی والی نرس ایک مریض کو لے کر باہر آئی اور بینچ پر بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔اچانک میری نظر زمین پر پڑی ہوئی ایک عورت پر پڑی، میلے اور بدرنگ کپڑے اس کے جسم پر تھے اور وہ کراہ رہی تھی۔

''اوہ'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میں اب تک اسے کسی مریض کے سامان کی گٹھڑی سمجھ رہی تھی۔اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ سانولے رنگ کی جوان عورت تھی۔ رخسار بیماری سے بیٹھ گئے تھے۔ بالکل بوڑھوں کی طرح۔ میرے دل میں جانے کیوں درد کی ایک ٹیس اٹھی یہ کون ہے؟ میں نے برابر بیٹھی ہوئی عورت سے پوچھا۔

''یہ!...... یہ میری بیٹی ہے۔''اس نے بڑے اپنائیت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں خاموش ہو گئی۔مگر نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔وہ بڑی بے چین ہو رہی تھی۔سانس لینے میں اس کے نتھنے پھول اور پچک رہے تھے اور آنکھوں میں بڑی بے بسی تھی۔ میں نے پھر دوسری عورت کی طرف دیکھا وہ اب آہستہ آہستہ منہ چلا رہی تھی۔شاید اس کے منہ میں پان تھا۔اس نے رُکتے رُکتے کہا۔

''بہو بھی بیٹی ہوتی ہے۔''

''بے شک......اگر سمجھو تو؟'' میں نے مُتاثر کن لہجہ میں اقرار کیا اور نظر اس کے احترام میں جھک گئی۔ساس کا رُوپ بڑا پیارا لگا۔

اچانک اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔نرس لپک کر اندر گئی۔ ڈاکٹر تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر آ گیا۔اس نے جھک کر عورت کو دیکھا وہ زرد پڑ گئی تھی سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

''اسے ایمرجنسی وارڈ میں لے چلو۔''ڈاکٹر نے سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

دونوں عورتیں اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ گئیں۔ زمین پر پڑی ہوئی عورت بڑی مشکل سے دیوار پکڑ کر کھڑی ہوئی۔اس کے پیر اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ڈاکٹر ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکر کے سائے چھا رہے تھے۔اس نے وارڈ بوائے کو اشارہ کیا اس کی مدد کرنے کو اس نے فوراً آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔مگر وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ اتنے میں سامنے سے ایک شخص اسٹریچر دھکیلتا ہوا لے آیا۔ادھیڑ عمر عورت نے منہ بنا کر ناگواری سے کہا۔

''اے بہو اپنے آپ کو سنبھالو دھیرے دھیرے چلنے کی کوشش کرو تم نے تو بالکل ہی گرا دیا اپنے آپ کو۔اب ایسے بھی دکھ۔ بیمار تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔معاً اسے ابکائی آ کر بڑی سی قے آئی۔ جسے وہ باوجود

کوشش کے نہ روک سکی۔اس کی آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں اور سارا جسم کانپ رہا تھا۔ پیشانی پسینے سے تر ہوگئی تھی۔

''اے ہے یہ کیا کیا تو نے۔'' اس کی ساس نے ناک سکیڑ کر خفگی سے کہا۔سب لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔اِدھر اُدھر کے کمروں سے بھی لوگ نکل آئے تھے۔ان میں ایک شلوار قمیض میں ملبوس جوان آدمی تھا جو جلدی سے آگے بڑھا اور اسے اسٹریچر پر لٹا دیا اور تمام لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔سب لوگ اپنی اپنی جگہ واپس آ گئے۔

ان عورتوں کے ساتھ سات آٹھ سال کا سہا ہوا سا ایک بچہ بھی تھا جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ اس بدنصیب عورت کا بچہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ یہ دنیا کتنی فریبی ہے، عیار، لوگ جیسے نظر آتے ہیں ویسے ہوتے نہیں۔

لڑکا بڑی حسرت بھری نظر سے اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر اس کی ماں کو لے گئے تھے ڈاکٹر بھی مریضہ کو دیکھنے چلا گیا تھا۔سفید ساڑھی والی نرس دروازے پر خاموش اداس سی کھڑی تھی۔ ماحول میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ میں واپس برآمدے کے آخری سرے پر چلی گئی۔ جہاں اب بھی بدستور مہندی کی باڑ جوں کی توں تھی۔ اب بھی پھول مہک رہے تھے۔البتہ اب کتا وہاں نہیں تھا۔چوکیدار اپنی کرسی پر جا بیٹھا تھا۔آسمان پر ہر طرف بادل تیر رہے تھے۔لیکن نہ جانے کیوں اب یہ سب مجھے حسین نہیں لگ رہا تھا جیسا پہلے لگا تھا۔ میں نے اکتاہٹ سی محسوس کی۔ چند لمحوں بعد میں واپس مڑی۔ وہ دونوں عورتیں اب ایکسرے روم کے آگے بینچ پر بیٹھی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ چل کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔وہ دونوں اردگرد سے بے نیاز محوِ گفتگو تھیں۔

اس کی ساس کہہ رہی تھی۔''اس مردار نے تو ہمیں پریشان کر دیا۔اچھا خاصا حکیم رحمت کا علاج تھا۔ پر دوا کھائے تب۔''

''یہ تمہارے بیٹے کو کیا ہو گیا۔'' دوسری نے پوچھا۔

''خبر نہیں کمبخت ماری نے کیا جادو کر دیا۔ وہ تو دیوانہ ہوا جا رہا ہے اس کے پیچھے اور تو اور کہتا ہے تم سب اس کی جان کے دشمن ہو۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔''دوا یہ کھائے نہیں۔پھل یوں ہی سڑ کر پھکے اب تم ہی کہو کیا اس کے منہ میں ٹھونس دوں جیسے مجھے اور تو کوئی کام نہیں بس اس کی ہر وقت تیمارداری کرتی رہوں۔ابھی پچھلے ماہ اس کی ماں کو بلایا تھا۔ وہ آئی اور اسے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔کہتی تھی ہائے میری پھول سی بچی یہ تجھے کیا ہو گیا۔

میں نے کہا بہن بیماری کا کیا تعجب اور اس میں ہمارا کیا قصور۔ اسے اپنی صحت کا خود خیال رکھنا چاہیے۔اب یہ بچہ تو ہے نہیں۔ جانتی ہو مکار کیا کہنے لگی۔ کہتی تھی ہاں تمہیں کیا دُکھ تم تو اور بیاہ لاؤ گی بیٹی تو میری جائے گی۔'' دوسری عورت نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

بیٹے سے کہو نا اسے ایسا موذی مرض ہے، ذرا دور رہے یہ مرض اُڑ کر لگتا ہے۔''

''نہ بہن وہ نہیں مانتا۔'' اس نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''الٹا مجھ دکھیا کو ہی الزام دیتا ہے۔ کہتا ہے تم سب نے لڑ لڑ کر اسے ان حالوں کو پہنچایا ہے۔ اب چاہتے ہو میں بھی اسے چھوڑ دوں۔'' وہ چاروں طرف دیکھ کر بولی۔ کچھ تو ہی سمجھا اس سر پھرے کو۔'' دوسری عورت نے اقرار کرتے ہوئے کہا''ضرور سمجھاؤں گی آخر وہ میرا بھی کچھ تو لگے ہے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ منہ چلاتے ہوئے بولی۔

''ارے تم کیا کہو گی۔ یہ عورت تو ایسی کٹھور ہے کہ ابھی ڈیڑھ ماہ پہلے بچہ ہوا تھا۔اسے اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔بس منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی۔ جب شام کو میاں آتا تو زبردستی کھانا کھلاتا۔نخرے دکھانے کی عادت ہووے ہیں بعضوں کو ...... مکار اپنے کرتوتوں سے بیمار پڑی بدنام میں ہوئی اللہ ہی بدلہ دے گا اس کا۔ پر مجھے تو دکھ اس کا ہے۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔''یہ نصیبوں جلی تو مر جائے گی۔ بچے کو بے ماں کر جائے گی۔اور......اور مجھے سدا کے لئے برا بنا جائے گی بیٹے کی نظروں میں۔'' اس نے زور سے اپنی آنکھیں پلو سے رگڑ دیں۔

میرا دل اس عورت کے لئے نفرت سے بھر گیا۔ میں نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا اور جی چاہا اس کے منہ پر تھوک دوں اور اتنی زور سے اس کے منہ پر تھپڑ ماروں کہ اپنا چہرہ پہچان نہ سکے۔اتنے میں وہ

جوان آدمی سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ وہ کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''اماں!...... ڈاکٹر کہہ رہا ہے۔ اسے سینی ٹوریم میں داخل کرو۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اماں اگر وہ مر گئی تو میں کیسے صبر کروں گا میرے خدا اسے زندگی دے دے۔ ابھی اسے زندہ رہنا ہے۔ اس کا بچہ برباد ہو جائے گا۔ اس کی ماں پاگل ہو جائے گی۔'' وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

اس کی ماں دم بخود بیٹھی اسے تک رہی تھی۔ چند لمحوں بعد دوسری عورت نرم لہجہ میں بولی۔

''گھبراؤ مت اچھی ہو جائے گی۔ اللہ اچھا کرنے والا ہے۔ پر کچھ اپنا بھی خیال کرو۔ مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا اور بیمار کی دیکھ بھال کرنا اچھا ہے پر یہ نہیں کہ خود ہی بیمار بن جائے۔ ادھر اپنی ماں کا بھی خیال کرو وہ بھی پریشان ہے۔ بڑھاپے کا وقت آ رہا ہے زیادہ کمزور ہو گئیں تو کیا ہو گا۔ بیوی بیوی کی جگہ ماں ماں کی جگہ۔ تم تو خود بھی خاصے سمجھ دار ہو۔

وہ اک دم بھڑک اُٹھا۔

''تمہیں کیا پتہ خالہ۔ اس کے ساتھ کیسی کیسی زیادتیاں ہوئی ہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ ایک غریب بیوہ کی بیٹی ہے۔ یہی اس کا قصور ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص اسے بری نظر سے دیکھتا ہے۔ میرے چھوٹے بہن بھائی اس کی ذرا عزت نہیں کرتے سارا سارا دن وہ کام میں جُتی رہی اور سب مزے سے باتیں بناتے رہے۔ اگر میں اچھی طرح پیش آؤں تو کہتے ہیں جادو کر دیا مجھ پر۔ ارے تم بیاہ کر کیوں لائے اسے۔ وہ بھاگ کر تو میرے ساتھ نہیں آئی۔ آخر اسے بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ بیمار ہوئی تو سب نے مکر کہا۔ جب ڈاکٹر کو بتایا تو اس نے صاف ٹی بی بتائی۔ اب پوچھ مکر تھا یا بیماری۔ لیکن ہمدردی کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگے کہ مرض اُڑ کر لگ جائے گا۔ اس لئے دُور رہتے ہیں پرہیز کرتے ہیں۔ گھن کرتے ہیں۔ جیسے سب کو اسی دنیا میں بیٹھے رہنا ہے۔ کوئی بیمار نہیں ہو گا۔ خدا کو بھول گئے۔'' وہ اپنی رو میں بولے چلا گیا۔ اسے اپنے اردگرد کی کچھ خبر نہ تھی۔ اس نے ایک لمحہ رُک کر پھر کہا۔

''جھگڑا پھر بھی برقرار رہا۔ کبھی خرچ پر کبھی دوا پر۔ سب جانتے ہیں کہ دوا کے ساتھ دودھ اور پھل ضروری ہیں تو اس پر فضیحتہ میں نے کھڑے ہو کر پلوایا تو واویلا۔ پھر وہ کیسے اچھی ہو گی۔''

اس نے بڑے حسرت بھرے لہجہ میں کہا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا اور منہ سے سسکیاں سی نکل رہی تھیں اور آنکھوں میں ویرانی سی جھانک رہی تھی۔ شاید وہ اسے بہت عزیز تھی۔ وہ پھر بولا۔ گھر میں اس کے نام سے دو دو سیر دودھ آیا اور اسے پاؤ بھی نصیب نہ ہوا۔

کیا یہ ظلم نہیں؟ کچھ تو ایمان کی بات کرو۔ سب کو خدا کے گھر جانا ہے۔ تم بھی بیٹیوں والی ہو خالہ کسی کا صبر نہ سمیٹو...... وہ تمام دن زچگی میں بھوکی پڑی رہی۔ کسی نے بات تک نہ پوچھی میں نے خود آ کر کھلایا۔ کیونکہ میری شریکِ حیات تھی میرے بچہ کی ماں تھی۔ مگر اس پر وہ جھک جھک ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ مجھے زن مرید ہونے کا طعنہ دیا گیا۔ کیا یہی ہے انسانیت۔ ارے تم عورت ہو کر عورت کا دُکھ نہیں بٹا سکتیں۔ اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتیں۔ وہ لمحہ بھر ٹھہر گیا۔ اس کے سانس کے ساتھ جذبات کی دھونکنی چل رہی تھی۔ ''اس کا بچہ مر گیا'' وہ پھر بولا۔ آج وہ ساری کہانی کہہ دینا چاہتا تھا۔ اپنے دل کا بوجھ اُتار پھینکنا چاہتا تھا۔'' اسے ظالم ٹھہرایا گیا۔ ارے جب اس سے اٹھے گا نہیں تو سنبھالے گی کیسے۔ دن رات بخار میں پھک رہی ہے۔ کھانسی سے اسے سانس نہیں لیا جا رہا ہے۔ کیا گھر میں کوئی اتنا نہ تھا کہ بچے کو سنبھال سکتا؟ کیا اس کے ساتھ سلوک کرنے سے میری ذات بھی غیر ہو گئی۔ مجھ سے کسی کا رشتہ نہ تھا؟ کیا وہ میرا بچہ نہ تھا؟ بولو جواب دو۔'' اس نے سینہ تان کر کہا۔ اس سمے وہ اتنا بہادر لگ رہا تھا، اتنا حسین کہ میں اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ میری نظروں میں وہ پہلا شخص تھا جو یوں انصاف کو للکار رہا تھا اور سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں گردنیں لٹکی ہوئی تھیں۔ خاموشی تھی، سناٹا تھا۔ ہر طرف صرف وہ سات سالہ بچہ حیرت سے اسے تک رہا تھا...... اپنے باپ کو۔

''مگر بھیا!'' وہ عورت دبے لفظوں میں آہستہ سے بولی جیسے

سرگوشی۔ ''تم خود جانتے ہو یہ مرض اڑ کر لگتا ہے۔ جی ہے تو جہان ہے۔ سب تمہارے بھلے کو کہتے ہیں۔ کوئی دشمن تو نہیں تمہارے۔''

''ہونہہ!'' وہ غصے سے بولا ''معلوم تھا تم یہی کہو گی۔ سب ایک جیسے ہیں۔ ظلم کرتے ہیں مظلوم بنتے ہیں۔''

''نہیں نہیں میرا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''ہاں ہاں میں سب سمجھتا ہوں۔ بیوقوف نہیں۔ تم چاہتی ہو میں بھی اسے چھوڑ دوں۔ مگر خدا کو کیا جواب دوں گا۔ اس نے میری، میرے گھر والوں کی خدمت کی میں نے اسے کھلایا پلایا اور اب کیونکہ یہ خدمت کرنے کے لائق نہیں تو اس سے منہ موڑ لوں۔ زہر دے دوں اسے۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا اور بہتر ہے اس حالت میں کوئی اس کے خلاف بات نہ بنائے۔ اگر ذرا سی بھی انسانی ہمدردی ہے تو''

اور مجھے یوں لگا وہ دو مکروہ شکل گِدھ تھیں جو مُردے پر جھپٹ کر اس کی تکہ بوٹی کر ڈالنا چاہتی ہوں۔

(مطبوعہ: بتول، ۱۹۸۴ء)

☆......☆......☆

چمن بتول کے انفرادی خریدار متوجہ ہوں

تمام انفرادی خریداروں کو رسالہ باقاعدگی سے بذریعہ ڈاک ارسال کیا جاتا ہے لیکن ہمیں یہ شکایات موصول ہوتی ہیں کہ بعض خریداروں کو رسالہ پہنچا نہیں ہے۔ اس کا صرف یہی حل ہے رسالہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیجا جائے۔ اس پر 200 روپے سالانہ مزید خرچ آئیگا۔ جو خریدار رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگوانا چاہے وہ براہِ کرم ہمیں مطلع کریں اور 200 روپے سالانہ کے حساب سے مزید زرتعاون ارسال کر دیں۔ (منیجر ادارہ بتول)

فرحی نعیم

دھند

کمرے کا ماحول بہت سرد تھا، عاتکہ بیڈ پر خاموشی سے بیٹھی ہوئی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا رہی تھی۔ اس کی بڑی بہن فوزیہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی اسے ہی بغور دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر پہلے عاتکہ سے ایک سوال کیا تھا جس کے جواب کی منتظر وہ اب بیٹھی اس کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ عاتکہ کا ردعمل اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ وہ الجھ رہی تھی۔ ''عاتکہ تم نے مجھے جواب نہیں دیا؟'' فوزیہ پوچھ رہی تھی۔

''نہیں بجو یہ ممکن نہیں۔'' عاتکہ کی نظریں اب بھی اپنے ہاتھوں پر ہی تھیں۔

''کیا مطلب؟ کیوں ممکن نہیں؟'' فوزیہ متحیر تھی۔

''بس'' وہ جواب میں اتنا ہی کہہ سکی۔

''مجھے بتاؤ عاتکہ؟ کیا الجھن ہے تمہیں؟'' فوزیہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، لیکن عاتکہ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور نظریں چرا کر رہ گئی۔ تمہیں معلوم ہے نا، خالہ جان یہ رشتہ کتنی محبت اور چاہت سے مانگ رہی ہیں اور نہ صرف خالہ جان بلکہ منیب کی بھی پسند اس میں شامل ہے، یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو، پھر کیا وجہ ہے تمہارے انکار کی؟''

''مجھے ابھی پڑھنا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''یہ کوئی بات نہ ہوئی، جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔''

''ابھی صرف گریجویشن ہی تو کیا ہے اور مجھے ابھی ماسٹرز کرنا ہے۔''

''شادی کے بعد پڑھ لینا، ہم ان سے کہہ دیں گے، انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' فوزیہ نے جیسے اس کا مسئلہ حل کیا۔

''مگر شادی کے بعد کہاں پڑھائی ہوتی ہے۔''

''پڑھنے والے ہر جگہ پڑھ لیتے ہیں اور تمہارا کون سا لمبا چوڑا سسرال ہے، اکیلا منیب اور اس کے والدین، تم تو خوش نصیب ہو جو تمہیں ایسا سسرال مل رہا ہے ورنہ لڑکیوں سے پوچھو کیسے سسرال جا کر پستی ہیں، سارا دن کام ہی کام بجو تو نان اسٹاپ شروع ہوگئی تھیں بس بجو میں نے کہا نا ابھی نہیں۔'' وہ جھنجھلائی۔

''ارے کیا نہیں نہیں، کوئی معقول بہانہ بناؤ'' وہ بھی اب غصہ میں آگئیں تھیں ''منیب جیسا لڑکا تو اس وقت سارے خاندان میں نہیں، قبول صورت، پڑھا لکھا، اسمارٹ، جاب بھی اچھی۔ دیکھا بھالا اور بھلا کیا چاہیے اور سب سے بڑھ کر بچپن سے ساتھ کھیلے کودے ہو تم لوگ، آخر تم کو اعتراض کس بات پر ہے، اپنے انکار کی کوئی ٹھوس وجہ بتاؤ؟''

''کوئی اعتراض نہیں۔''

''جب کوئی اعتراض بھی نہیں، ٹھوس وجہ بھی تمہارے پاس نہیں تو کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔''

''کوئی مسئلہ نہیں، بس آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں، خدا کے لئے۔'' اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

''ٹھیک ہے ابھی تو میں جا رہی ہوں، تم اچھی طرح سوچ لو، ہم پھر بات کریں گے۔'' وہ غصہ سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور وہ تھکے تھکے انداز میں تکیے پر گر سی گئی۔ ''کیا بتاؤں میں آپ کو بجو، آپ نہیں جان سکتیں، نہیں میرا مسئلہ سمجھ سکتیں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

☆......☆......☆

''ہائیں عاتی منع کر رہی ہے، وہ بھی میرے بیٹے کو، اس کا دماغ تو درست ہے، ایک دنیا میرے بیٹے کی دیوانی، اسے حاصل کرنے کی خواہشمند، وہ کہاں کی شہزادی ہے؟'' سلطانہ بڑبڑا رہی تھیں۔ ''کیا ہوا امی جان؟'' منیب آستین کے بٹن بند کرتا ہوا وہیں آ گیا تھا۔

''ارے ابھی روبینہ کا فون آیا تھا اس کو کہیں سے یہ سن گن ملی ہے کہ عاتکہ اس رشتے پر راضی نہیں۔'' وہ بیٹے سے اب مخاطب تھیں۔

''آپ کو معلوم تو ہے یہ روبینہ آپا، ادھر اُدھر سے سن کر آگے بڑھا دیتی ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''لیکن وہ کہہ رہی تھی کہ بڑی مصدقہ اطلاع ہے۔'' امی کچھ الجھتے

ہوئے بولیں۔

''ارے چھوڑیں امی جان ایسے ہی بے پر کی اڑا رہی ہوں گی۔''

وہ لاپروائی سے بولا۔

''اچھا آپ چائے تو بنائیں پھر مجھے جانا ہے۔''

''کہاں جارہے ہو؟''

''علی کے پاس، اس نے بلایا تھا۔''

''لیکن اگر یہ بات صحیح ہوئی تو......''

''اگر صحیح ہوئی تو دیکھا جائے گا، ویسے مجھے اس کا یقین نہیں۔''

''ہاں یقین تو مجھے بھی نہیں اور، ایک اور قصہ سنو۔''

''اب کیا ہو گیا؟'' منیب نے بھنویں اچکائے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''سن تو میں کئی دن سے رہی تھی پہلے تو مجھے صرف شبہ ہی تھا لیکن رات کو تمہارے بابا نے بتایا تو مجھے یقین آ گیا۔ پہلے ہی کیا کم پریشانیاں ہیں جو یہ ایک اور......''

''کیا ہوا امی جان، بابا کی جاب کی بات ہے؟''

''نہیں جاب واب کی بات نہیں تمہارے چاچا میاں کا ڈرامہ''

''چاچا میاں کا؟ اوہو آپ ٹھیک سے بتائیں نا۔''

''تمہارے چاچا اپنی رافعہ کو ہمارے سر منڈھنا چاہتے ہیں۔''

''رافعہ کو؟''

''ہاں اس لڑکی کو جو بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ تیز ہے، واہ جی میرا بیٹا نہ ہو گیا کوئی لاٹری کا ٹکٹ ہو گیا جو سب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی زبردستی ہے۔''

''امی جان آپ کیا کہہ رہی ہیں، بابا نے کیا کہا ہے؟''

''تمہارے چاچا نے کل تمہارے بابا کو گھر بلایا تھا۔ وہ آفس سے سیدھے پھر وہیں چلے گئے تھے۔ انہوں نے تمہارے بابا کو سیدھا سیدھا رافعہ کا رشتہ دے دیا ہے تمہارے لئے کہ میری بیٹی اور اپنے بیٹے کا نکاح کر دو ورنہ تعلق ختم، واہ کوئی زبردستی ہے؟ پہلے ہی میں نے دو تین سے اپنی جان خلاصی کروائی یہ کہہ کر کہ میں نے تو اپنے بچے کی بات طے کر رکھی ہے۔ ہر کوئی میرے ہیرے جیسے اکلوتے بیٹے کے پیچھے پڑا ہے۔ اور جن کو بہو بنانے کا سوچا ہوا ہے وہاں سے ابھی کوئی جواب نہیں، تمہارے چاچا کی طرف سے بھی مجھے کچھ اسی طرح کی خبریں تھیں کہ وہ اپنی کسی بیٹی کا رشتہ چاہ رہے ہیں اسی لئے میں نے جلدی سے عاتی کا پیغام ڈالا لیکن لگتا ہے کسی حاسد نے یہ خبر تمہارے چاچا کے ہاں پہنچا کر ہی دم لی جبھی تو انہوں نے تمہارے بابا کو لائن حاضر کر لیا۔ وہ چھوٹے بھائی سے دب گئے اور یہ بھی نہ کہہ سکے کہ ہمارا بیٹا ہے، ہماری مرضی ہم جہاں چاہے اس کا رشتہ کریں، ان کی بات سن کر خاموشی سے آ گئے۔'' امی جان بے حد غصے میں تیز تیز بول کر کچھ لمحوں کے لئے چپ ہوئیں۔

''تو اب چاچا میاں کو بتا دیں۔'' منیب بھی رافعہ کو سوچ کر ہی گھبرا گیا تھا۔ رافعہ واقعی بڑی ہوشیار لڑکی تھی جبکہ وہ خود عاتکہ کو پسند کرتا تھا۔

''ارے ہاں وہ تو ہم بتا ہی دیں گے، لیکن یہ تو دیکھو کہ کس بیٹی کا کہہ رہے ہیں۔ اس کا جس کو کوئی نہ قبول کرے، نہ شافعہ نہ فاریہ کا، اور ساتھ تعلق ختم ہونے کی بھی دھمکی دے رہے ہیں۔ کر دیں تعلق ختم، ہم تو کبھی نہ کریں ان کی بیٹی سے شادی، کیوں صحیح کہہ رہی ہو ناں؟'' امی جان نے اچانک اس سے پوچھا، تو وہ جو کسی سوچ میں تھا یکدم چونک پڑا۔ آں، ہاں، جی ہاں۔''

''کل میں خود جاتی ہوں تمہاری خالہ کی طرف، یہ روبینہ نے تو مجھے پریشان ہی کر ڈالا، نہ جانے سارے خاندان کی خبریں کہاں سے مل جاتی ہیں اسکو، اللہ جانے کونسے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں اس نے۔''

''تو آپ فون کر لیں نا خالہ کو۔''

''فون پر نہیں ہوتیں ایسی باتیں، پھر خود دیکھوں کیا ارادے ہیں ان لوگوں کے۔''

وہ یہ کہہ کر کچن کی طرف چائے بنانے چل دی۔ دوسری طرف منیب کے ماتھے پر بھی سوچ کی لکیریں واضح تھیں۔

☆......☆......☆

دوسرے دن وہ سویرے ہی کام نمٹا کر بہن کے گھر روانہ ہو گئیں اور پھر وہاں جا کر بہن اور بھانجی کے چہرے پڑھتی رہیں۔ بھانجی کترا رہی تھی تو بہن کا چہرہ شرمندگی اور بے چارگی لئے ہوئے تھا۔ تب ان کو اندازہ ہوا کہ روبینہ نے کچھ غلط نہ کیا تھا۔ کافی دیر دونوں بہنیں ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں پھر آخر کار وہ اپنے موضوع پر آئیں۔ جس مقصد

کیلئے وہ یہاں آئی تھیں۔ ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ بہن فی الحال اس موضوع سے دامن بچانا چاہ رہی ہے۔

رضوانہ! کیا بات ہے تم لوگوں نے مجھے اب تک جواب نہیں دیا۔'' انہوں نے سیدھی بات کی۔

''کس بات کا جواب آپا'' وہ کچھ انجان بنیں۔تب سلطانہ نے ہونٹ سکوڑے چہرے کے تاثرات لمحہ بھر کو بدلے تھے۔شبہ یقین میں تبدیل ہوا تھا۔

''عاتکہ اور منیب کے رشتے کا اور کس کا؟'' انہوں نے اپنے اوپر ضبط کرتے ہوئے کہا ورنہ دل تو کچھ اور ہی کہنے کا چاہ رہا تھا۔

''وہ دراصل، عاتکہ کے ابو نے ابھی کچھ.....'' رضوانہ بات بنانا چاہ رہی تھیں لیکن ان سے بات بن نہ پا رہی تھی۔

''مجھے سیدھی طریقے سے بتاؤ رضوانہ اصل بات کیا ہے؟'' سلطانہ سے اب مزید برداشت نہ ہو پا رہا تھا۔ روبینہ کی طنزیہ گفتگو، بہن کا گریز، بھانجی کا منظر سے غائب ہو جانا یہ سب ایک نئی کہانی سنا رہا تھا جس پر یقین کرنے کا ان کا دل نہیں مان رہا تھا۔

''آپا، کوئی.....کوئی بات نہیں ہے، بس عاتکہ کے ابو کچھ اپنے مسئلے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں لہٰذا اس سلسلے میں ہماری کوئی ٹھیک سے بات ہو نہ سکی۔ بس میں آپ کو جلد ہی خوشخبری سناؤں گی۔'' رضوانہ نے بات بنا ہی لی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو؟ یہی بات ہے نا'' سلطانہ نے بہن کو بغور دیکھا۔

''ہاں آپا اور بھلا کیا بات ہو سکتی ہے۔'' رضوانہ نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' وہ بھی جیسے کچھ ہلکی ہوئیں۔ ''ٹھیک ہے، بس جلدی کر لو اب مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا میں چاہتی ہوں اب جلد ہی منیب کی شادی کر دوں، بہو گھر آئے، کچھ رونق ہو، اب تو اکیلے رہ رہ کر دل گھبرانے لگتا ہے۔''

ابھی وہ کچھ اور کہتیں کہ رضوانہ نے ان کو دوسرے موضوع کی طرف لگا دیا اور وہ بھی دوسری طرف لگ کر باتیں کرنے لگیں جس پر رضوانہ نے شکر کا سانس لیا۔ وہ یہی سوچ رہی تھیں کہ ایک دفعہ عاتکہ کو بٹھا کر اس سے سنجیدگی سے اس سلسلے میں بات کریں گی کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔ آخر وہ کہاں تک بہن کو ٹالیں گی۔ ویسے بھی ان کی اپنی یہ دلی خواہش تھی کہ عاتکہ آپا کی بہو بنے۔

☆......☆......☆

''فارغ ہو جاؤ تو ادھر ہی آ جانا اپنے کمرے میں نہیں چلی جانا۔'' عاتکہ دوپہر کے کھانے کے بعد برتن سمیٹ رہی تھی تو امی نے اس سے کہا تھا۔ اس نے چونک کر امی کو دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر برتن دھوتے ہوئے وہ امی کے متوقع سوالوں کے جواب ہی سوچتی رہی۔ اور ویسے بھی کل سے بڑی خالہ جان کے جانے کے بعد سے امی بڑی گہری سوچ میں تھیں اور خاموش بھی اور وہ کل سے اپنا ذہن تیار کر رہی تھی کہ کس طرح امی کو اپنی بات سے قائل کرنا ہے۔ وہ برتن دھو کر کچن صاف کر کے امی کے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے ناخنوں کو گھورنے لگی۔ دل خواہ مخواہ بھر آنے لگا تھا۔ اور اس سے پہلے کی امی اس سے کچھ پوچھتیں وہ امی کے کندھے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

''ارے ارے عاتکہ کیا ہوا؟'' لیکن جواب میں وہ آنسو بہاتی رہی۔

''عاتی میری بچی مجھے بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے۔ آخر تمھارے انکار کی وجہ کیا ہے؟''

''اگر میں کہوں کہ وہ بات میں آپ کو نہیں بتا سکتی تو کیا آپ اس کے باوجود خالہ جان کو منع کر دیں گی۔ صرف میرا اعتبار کر کے؟'' عاتکہ بے دردی سے آنکھیں پونچھتی ہوئی بولی۔

''دیکھو مجھے وہ بات بتاؤ جس کی بنیاد پر تم انکار کر رہی ہو، میں تمھاری ماں ہوں، مجھ سے اس طرح مبہم باتیں نہ کرو۔ اگر واقعی تمھارے انکار میں وزن ہوا تو میں کیوں تم کو اس کے ساتھ بیاہوں گی، مجھے تم زیادہ پیاری ہو نہ کہ منیب اور آپا۔'' امی اس کے بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتی ہوئی بول رہی تھیں۔ اس کے اس طرح رونے سے ان کا اپنا دل پسیج گیا تھا۔

''امی......امی آپ جانتی ہیں نا کہ میں کتنی حساس طبیعت کی

ہوں، مجھ سے کسی کی تکلیف، کسی کا دکھ، پریشانی بالکل برداشت نہیں ہوتی، میری اس حساس طبیعت نے خود میرے لیے کتنے مسائل پیدا کئے ہیں، میرا کتنا نقصان کیا ہے یہ آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی اور اب میں شاید اپنا بہت بڑا نقصان کرنے جارہی ہوں مجھے لگتا ہے کہ یہ حساسیت مجھے کہیں کا نہیں چھوڑے گی اور اگر میں نے یہ شادی کرلی تو میں اپنے آپ کو مجرم سمجھتی رہوں گی چین سے نہ رہ سکوں گی۔''

''میں جانتی ہوں تمھارے مزاج کو بچپن سے تم اپنے بہن بھائیوں کے لیے جان دیتی آئی ہو لیکن اب معاملہ مختلف ہے یہ تمھاری زندگی کا معاملہ......''

''بس امی، یہی سب میں سوچ رہی ہوں یہ چند دن کی بات نہیں پوری زندگی کا معاملہ ہے۔'' وہ امی کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''دیکھو، یہ تمھارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے حقیقت بتاؤ، وہ سب جو تمھارے دل میں ہے۔'' امی نے سچ مچ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور اب وہ مزید برداشت نہ کرسکی اور ان کی گود میں سر رکھ کر وہ آہستہ آہستہ آنسوؤں کے بیچ ان کو وہ ساری حقیقت بتانے لگی جو اس کے انکار کی وجہ تھی۔

امی حیرت زدہ سی وہ انہونی سن رہی تھیں جو وہ انھیں سنا رہی تھی۔

''تم جو کچھ کہہ رہی ہو کیا یہ سب اسی طرح ہے۔'' عاتکہ کے خاموش ہونے پر امی پرسوچ لہجے میں اس سے پوچھ رہی تھیں۔

''جی امی یہ سب بالکل سچ ہے۔''

''تمھیں یقین ہے؟'' امی مشکوک تھیں۔

''جی جی امی بالکل۔''

''اگر یہ سب حقیقت بھی ہے تو بھی، تم کیوں اپنے اوپر ظلم کر رہی ہو، تم اپنی زندگی جیو، بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' امی جیسے مطمئن لہجے میں بولیں۔

''امی!!'' عاتکہ متحیر تھی۔ ''آپ......آپ......''

''ہاں کیا آپ آپ، یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں کہ تم جوگ لے لو۔''

امی کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

''آپ کے لیے نہیں ہوگی، لیکن میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔''

''عاتکہ پاگل نہ بنو، ابھی میں نے صرف تمھاری وجہ سے تمھارے ابو کو بھی ٹھیک سے نہیں بتایا۔ صرف سرسری ذکر کیا تھا کہ آپا بات ڈال رہی ہیں۔ حالانکہ وہ تمھارا رشتہ دے چکی تھیں لیکن تمھارے بدلتے رویے کے سبب کچھ نہ کہا کیونکہ وہ پھر مجھ سے تمھارے انکار کی وجہ پوچھیں گے تو میں کیا وجہ بتاؤں گی؟ یہ؟ یہ وجہ بتاؤں گی کہ ان کی بیٹی اس معمولی بات کے پیچھے اتنا اچھا لڑکا رد کر رہی ہے اور ویسے بھی تمھارے بارے میں فیصلہ کا اختیار ہمیں ہے، اگر تم سے پوچھ رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ایسی احمقانہ باتوں کو بنیاد بناؤ اور اپنی زندگی خراب کرو۔'' امی کچھ غصہ کچھ ناراضگی سے کہہ رہی تھیں۔

''یہ معمولی بات نہیں ہے امی، آپ میری بات کو کیوں نہیں سمجھ رہیں، یہ کسی کی زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔''

''ہونے دو، شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا، یہ سب نادانی کی باتیں ہیں۔''

''اف، اف، امی آپ کیوں اتنی بے حس ہو رہی ہیں۔ اور میں نے کہہ دیا کہ آپ ابو سے کوئی بات نہیں کریں گی اور خالہ جان کو انکار کر دیں ورنہ یہ کسی کے لیے اچھا نہیں ہوگا نہ میرے لیے اور نہ منیب کے لیے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے صوفہ سے اٹھی اور آنکھوں میں آئے پانی کو رگڑتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف تیزی سے بڑھ گئی۔ امی پریشانی سے سر ہاتھوں میں تھام کر رہ گئیں۔ کوئی یوں بھی اذیت سہتا ہے!

☆......☆......☆

ابھی یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا تھا کہ یہ بات خاندان بھر میں پھیل گئی کہ منیب کے چاچا اپنی بیٹی کا رشتہ دے رہے ہیں اور نہ ماننے کی صورت میں انھوں نے منیب کے گھر والوں کو دھمکی دی ہے کہ تعلق کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زندگی بھی ختم کرلیں گے۔ جس نے سنا دنگ رہ گیا۔

☆......☆......☆

بابا (منیب کے والد) ابھی آفس سے گھر آئے تھے کہ ان کے چھوٹے بھائی سراج احمد کا فون آیا۔ پہلے تو انھوں نے بابا سے اپنی کہی بات کا جواب مانگا اور جب بابا نے ان سے ہکلاتے ہوئے کہا کہ ابھی وہ اس بارے میں سوچ رہے ہیں تو چھوٹے بھائی نے صاف اور واضح الفاظ میں ان سے کہہ دیا کہ اگر تم میری زندگی اور تعلق چاہتے ہو تو یہ رشتہ کرو ورنہ میرا مرا ہوا منہ بھی نہ دیکھنا۔ بابا تو سن کر دھک سے رہ گئے۔ کتنی ہی دیر وہ ریسور ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔ بھائی کے منہ سے مرنے کی بات سن کر ان کو تو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ وہ ان کا چھوٹا بھائی تھا لیکن شروع سے مزاج کا تیز، سراج بچپن سے ہی اپنے بڑے بھائی بہن پر حاوی تھے۔ وہ غصے میں جو منہ میں آتا کہتے اور اس کو کر گزرنے میں بھی کوئی عار نہ سمجھتے۔

آج تو انھوں نے حد ہی کر دی تھی۔ رشتہ نہ دینے پر اپنی زندگی کے خاتمے کا عندیہ دے دیا تھا۔

سلطانہ بیگم نے میاں سے جب یہ بات سنی تو گویا ان کے تو تلووں کو لگی۔ ''ارے، آپ کے بھائی کا دماغ تو ٹھکانے پر ہے، وہ اپنے ہوش و حواس میں ہیں یا بالکل ہی کھو چکے۔'' سلطانہ بیگم تو آپے سے ہی نکل گئیں۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں پچھلے تیس سالوں سے تم خود دیکھ رہی ہو وہ مزاج کا کتنا تیکھا ہے جو کہتا ہے پھر کر کے رہتا ہے۔'' بابا تو خود بے بسی سے ہاتھ مل رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کریں۔

''تو کریں میں بھی دیکھتی ہوں، وہ آپ کے چھوٹے بھائی ہیں آپ بڑے ہو کر ان کو سمجھا نہیں سکتے اور وہ چھوٹے ہو کر جو دل چاہیں کریں۔ آپ انھیں بتا دیں کہ ہم نے منیب کی بات طے کی ہوئی ہے لہٰذا وہ ہمیں معاف کر دیں اور تعلق توڑنا ہے تو توڑ دیں۔''

''بیگم وہ صرف تعلق ہی توڑنے کی بات نہیں کر رہا بلکہ وہ تو وہ تو ......''

''ارے سب گیدڑ بھبکیاں ہیں کوئی اتنا آسان ہے جان لینا، میرا ایک ہی ایک بیٹا اور اُسے بھی کیا میں آپ کے بھائی کی ضد اور خواہش کی بھینٹ چڑھا دوں۔'' وہ سچ مچ روہانسی ہو گئی تھیں۔

''تم، تم ایسا کرو اپنی بہن سے بات کرو اور ان سے معذرت کر لو، جہاں تک عاتکہ کے ابو کی بات ہے تو میں انھیں ساری......''

''معذرت آپ اپنے بھائی سے کریں۔'' وہ زور سے میاں کی بات کاٹ کر بولیں۔

''میں اپنے بیٹے کی شادی عاتکہ سے کر رہی ہوں اور اگلے ہفتے ہی کر دوں گی۔ یہ آخر سراج بھائی سمجھتے ہی کیا ہیں اپنے آپ کو کوئی اس طرح زبردستی ہوتی ہیں شادیاں؟ ان سے صاف کہہ دیں بہت ہو گئی دھونس، دھمکی نہ ہم مانتے ہیں اور نہ ہمارا بیٹا۔'' ان کا لہجہ شعلہ بار تھا اور بابا ان کو دیکھ کر رہ گئے۔ ایک طرف بھائی تھا تو دوسری طرف بیٹا۔ کیا کریں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

منیب کے گھر آتے ہی امی جان نے جب اسے چاچا کے نئے ''ڈرامے'' سے آگاہ کیا تو ناگواری اور حیرت سے اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن وہ خاموش ہی رہا۔

''ارے کچھ تو بولو، یوں گپ چپ کیوں ہو گئے۔ تمھارے بابا تو سمجھو راضی ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح دب گئے، لیکن میں کہتی ہوں ہم کل خود جا کر ان سے دوٹوک بات کر کے آئیں گے۔ ٹھیک ہے نا منیب۔''

''میرے خیال سے آپ پہلے خالہ کی طرف جا کر معلوم کر لیں۔'' وہ طنزاً بولا تھا۔

''کیوں نہیں، میں نے پہلے ہی تمھارے بابا سے کہہ دیا اگلے ہفتے ہی میں تمھاری اور عاتکہ کی شادی کر رہی ہوں۔'' وہ ابھی یہ کہہ رہی تھیں کہ منیب اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''کہاں جا رہے ہو میں کھانا لگا رہی ہوں۔ ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔''

''امی جان مجھے بھوک نہیں۔'' اس کا لہجہ تھکا تھکا تھا۔

''کیوں کیا باہر کھا لیا؟''

''نہیں۔''

''تو پھر؟'' وہ سوالیہ نظروں سے پوچھ رہی تھیں۔

لیکن وہ آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے نکل گیا۔ منیب نے آج ہی عاتکہ سے فون پر بات کی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ وہ خود ہی عاتی سے بات صاف کرے کہ وہ لوگ کیوں اتنی دیر لگا رہے ہیں، امی اور خود

اس کے ذہن میں شکوک جنم لے رہے تھے اور عاتکہ نے ان سب شبہات کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ خود یہ شادی نہیں کرنا چاہ رہی تھی اور منیب کو بھی اپنے فیصلے میں شریک کر رہی تھی اور منیب کے اصرار پر اس نے حقیقت بتا دی تھی۔ اگرچہ منیب نے اپنی صفائی دینے اور سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی تھی۔

یہ بہت بڑی بے وقوفی کر رہی ہو تم......اور پھر

آخر اس میں میرا کیا قصور جو مجھے سزا سنا رہی ہو۔'' منیب کے لہجہ میں کیا نہیں تھا، بے بسی، لاچاری...... عاتکہ ٹوٹ رہی تھی۔

''قصور کسی کا نہیں، بس شاید ہماری قسمت کا ہے اور قسمت کا لکھا قبول کرنا ہی ہوتا ہے۔'' وہ اپنے اوپر کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔

''کیا تم نے بھی قسمتیں لکھنی شروع کر دیں؟'' وہ چڑا۔

''اف کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' عاتی نے جھرجھری لی (نعوذ باللہ) ''بس اب آپ خالہ جان کو بھی کنوینس کر لیں۔ اب یہ آپ کے ذمہ ہے۔'' اور اس نے منیب کا جواب سنے بغیر لائن کاٹ دی، شاید ہمیشہ کے لیے!

ایک طرف عاتی کا انکار دوسری طرف چاچا میاں کی دھمکی، وہ عجیب مخمصے میں پڑ گیا بلکہ وہ کیا سارا گھر چاچا میاں کی دھمکی سے پریشانی اور اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ ابھی اس نے امی کو عاتی کے فیصلہ سے آگاہ نہیں کیا تھا ورنہ شاید امی غصہ میں نہ جانے کیا کچھ کہہ جاتیں اور اس دن کسی نے بھی کھانا نہ کھایا امی نے سارا کھانا اٹھا کر فریج میں رکھا اور منہ سر لپیٹ کر پڑ گئیں۔ ان کے سر میں درد شروع ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

اگلا سارا دن وہ ایسی ٹینشن اور سر درد کی وجہ سے گھر میں رہیں۔ نہ بہن کے گھر جا سکیں اور نہ ہی دیور کے پاس، ان کو کھری کھری سنانے، اور یہ چند گھنٹے خاندان میں اس بات کو پھیلانے کے لیے کافی تھے۔ عاتکہ اور رضوانہ کو جب منیب کے چاچا کے اس انتہائی فیصلہ کے بارے میں سن گن ملی تو دونوں ہی ششدر رہ گئے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے، بات تو آپا نے یہاں ڈالی، پھر کیوں ان کے دیور سراج بھائی ایسی بات کر رہے ہیں۔'' رضوانہ نے آج میکہ آئی بڑی بیٹی فوزیہ سے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا، اب خالو جان کا نہ جانے کیا فیصلہ ہو وہ بیٹے کی شادی سالے کے گھر کریں گے یا اپنے بھائی کے گھر......''

''اپنے بھائی کے گھر، اور یہی سب کے حق میں بہتر ہے۔'' امی سے پہلے عاتکہ نے جواب دیا۔

''کون سب؟ اور تم تو چاہتی ہی یہی تھیں، اب خوش ہو جاؤ۔'' فوزیہ نے غصہ سے جواب دیا۔

''تو پھر آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں کسی کی موت کی ذمہ دار بن کر شادی رچاؤں اور ساری زندگی خود کو خوشیوں سے بھی محروم رکھوں اور خالو جان کی نظروں میں بھی معتوب رہوں۔''

''افوہ تم تو پہلے سے ہی سارا نتیجہ نکالے بیٹھی ہو۔'' فوزیہ کے ماتھے پر بل گہرے ہوئے۔

''امی آپ بتائیں، خاندان میں پھوٹ پڑنے سے بہتر یہ نہیں کہ ہم اس معاملے سے الگ ہی ہو جائیں، آج اگر کچھ لوگ ہمارے حمایتی بن جائیں گے تو کل کو وہی لوگ ہمیں جینے نہیں دیں گے۔'' عاتکہ نے امی کو دیکھتے ہوئے کچھ جتاتے ہوئے کہا اور امی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ عاتکہ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کے انکار کو اب ایک اور مناسب جواز مل گیا تھا۔

''میں تمھارے ابو سے بات کرتی ہوں۔ دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔'' اور ابو کو جب ان حالات کا علم ہوا تو انھوں نے فوراً ہی بیوی سے کہا۔

''یہ تم کہاں میری بیٹی کو پھنسا رہی ہو، یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے، بھائی فیاض جانیں اور ان کے بھائی، تم اپنے آپ کو اور عاتی کو اس معاملے سے الگ ہی کر لو تو بہتر ہے، میری بچی ابھی مجھ پر بھاری نہیں، تم فون کر کے خود ہی معذرت کر لو۔'' انھوں نے بات ہی ختم کر دی اور ان کے فیصلے اٹل ہی ہوتے تھے۔

اور اس سے اگلے دن سلطانہ ابھی منیب کے چاچا کے گھر جانے

کے ارادے سے تیار ہی ہورہی تھی کہ رضوانہ نے ان کو فون کرلیا۔

''السلام علیکم آپا۔''

''وعلیکم السلام، کیسی ہو رضوانہ، اچھا کیا فون کرلیا۔ تم گھر پر ہی ہونا، میں آج آرہی ہوں، بس ہم آج ہی سارے معاملات طے کر لیں گے، میں چاہتی ہوں اسی مہینے شادی ہوجائے زیادہ شور شرابے کی ضرورت نہیں بس سادگی ......'' ابھی وہ جانے اور کیا کیا کہتیں کہ رضوانہ نے ان کی بات کاٹی۔

''آپ کیا ابھی آرہی ہیں۔''

''نہیں ابھی تو نہیں، ابھی تو میں سراج بھائی کی طرف جارہی تھی۔''

''کیوں خیریت؟''

''وہ اصل میں، اب تم سے کیا چھپانا اور پھر میرے خیال سے یہ بات آدھے خاندان کو تو پتہ چل ہی گئی ہے اور شاید تمھیں بھی معلوم ہو کہ منیب کے چچا کس قسم کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہے ہیں تو انھیں ہی سمجھو، سمجھانے یا باز رکھنے کے لیے جارہی ہوں۔''

''اور اگر آپا وہ نہ مانیں، بات بڑھ جائے!''

''ارے کیسے نہیں مانیں گے، ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں وہ ہوتے کون ہیں ایسی زبردستی کرنے والے۔''

''اصل میں آپا......'' وہ اٹکیں۔ ''میں نے آپ کو اسی لیے فون کیا تھا ہمیں بھی حالات کی نزاکت کا علم ہو رہا ہے اس سے پہلے کہ خاندانی چپقلش بڑھے اور خوامخواہ میری بیٹی اس سیاست کی نظر ہو یا اس کا نام آئے عاتی کے ابو کی یہی رائے ہے کہ...... کہ، آپا مجھے بہت افسوس ہے اور دکھ بھی لیکن ہماری طرف سے معذرت۔'' وہ دکھے دل سے کہہ رہی تھیں۔

''ہائیں، ارے رضوانہ کیا کہہ رہی ہو، دیکھو میں ابھی جا تو رہی ہوں پھر ہم اطمینان سے بات کریں گے، سراج کی یہ بچگانہ ضد ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے۔''

''مان جائیں تو اچھا ہے لیکن آپا اب آپ ہمیں تو اس معاملے سے الگ ہی کردیں، میرے خیال سے یہ ہم دونوں گھرانوں کے لیے مناسب ہے۔ اچھا آپا دروازے پر کوئی ہے، پھر بات کریں گے۔ خدا حافظ۔''

اور یہ کہہ کر انھوں نے جلدی سے فون بند کر دیا مبادا آپا پھر انھیں قائل کریں۔ اگرچہ انھیں اس بات کا بڑا قلق تھا لیکن شاید یہی بہتر تھا۔ سلطانہ حیران نظروں سے کتنی ہی دیر ریسیور دیکھتی رہیں۔ یہ کیا کہہ دیا تھا ان کی بہن نے، انکار، ہاں صاف جواب لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں۔

''تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔'' ایک لہر تھی غصہ کی جو ان کے اندر اٹھی تھی۔ انھوں نے غصہ سے ریسیور پٹخا اور کتنی ہی دیر اپنے آپ کو کمپوز کرتی رہیں۔

اب سراج بھائی کے گھر جا کر وہ کیا کہیں گی جس بہن بھانجی کے آسرے پر وہ منع کرتیں اور انھیں بیٹے کی فوراً شادی کرنے کی نوید سناتیں وہاں سے تو انکار ہی ہوگیا تھا۔ اب میاں سے کیا کہیں گی اور منیب!! وہ منیب یہ سب سن کر کتنا پریشان ہوگا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ غم و غصہ ایک ساتھ ان پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسی وقت منیب کمرے سے باہر نکلا، ماں کو اتنا پریشان دیکھ کر ٹھٹکا پھر وہیں ان کے پاس چلا آیا۔

''کیا ہوا امی جان؟''

''کیا بتاؤں، ایسا لگتا ہے پریشانیوں نے ہمارے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔ ''ابھی ابھی تمھاری خالہ کا فون آیا ہے، انھیں بھی تمھارے چاچا میاں کی دھمکی معلوم ہوچکی ہے لہٰذا اس کو بنیاد بنا کر انھوں نے ......'' ان سے جملہ پورا نہ ہوا۔

''رشتہ ختم کر دیا۔'' منیب نے ان کی بات مکمل کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے وہ ختم کر دیں ان کو اختیار ہے لیکن اب آپ برائے مہربانی ان کو دوبارہ فون مت کیجیے گا۔''

''مگر بیٹا اتنی جلدی دوسری لڑکی میں کہاں تلاش کروں، آخر تمھارے چاچا کے سامنے بھی تو کوئی مضبوط جواب رکھنا ہے ورنہ وہ تو ہم کو مجبور کر دیں گے، تمھارے بابا نے تو ویسے ہی شکست تسلیم کی ہوئی

ہے ان کے سامنے، لیکن میں اور تم تو پسپائی نہ اختیار کریں۔''

''شکست، ہونہہ۔''

''وہ ہمارے سر رافعہ ڈال کر ہی دم لیں گے اور میں ایسا ہونے......۔''

''تو کرنے دیں ان کو اپنی ضد پوری۔'' منیب کے منہ سے ایسی غیر متوقع بات سن کر امی جان تو جھٹکا کھا کر رہ گئیں۔

''تت......تم کیا کہہ رہے ہو، منیب ہوش میں ہونا؟''

''جی ہاں امی، میں رافعہ سے شادی پر تیار ہوں، جب عاتی نہیں تو پھر کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

سلطانہ بیگم کے تو جیسے کسی نے دل کے ٹکڑے کر دیے ہوں۔ منیب ان کا اکلوتا لاڈلا بیٹا...... وہ یوں بکھرے ان کے لیے نا قابل برداشت تھا۔

''میں عاتی سے بات کرتی ہوں بلکہ بھائی جان (عاتی کے والد) سے، تم پریشان نہ ہو۔''

''امی جان کوئی فائدہ نہیں، سب بے کار ہے، خود عاتی ہی نے مجھے انکار کر دیا ہے، لہٰذا اب چاچا میاں سے لڑنے جھگڑنے سے بہتر ہے خاموشی سے ان کی بیٹی کو لے آیا جائے یہی مناسب ہے۔''

''عاتی نے ......؟'' وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ مگر پھر جلد ہی خود کو سنبھال کر بولیں۔

''بیٹا اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو، اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ ابھی تو ہم چل رہے ہیں نا تمھارے چاچا میاں کی طرف پھر دیکھتے ہیں، ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔'' وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھیں لیکن منیب مایوسی سے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ''اور یہ عاتی کون ہوتی ہے انکار کرنے والی، میں رضوانہ کو سمجھاؤں گی تم دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں نے ہار مان لی ہے امی جان۔''

''ایسے کیوں کہہ رہے ہو ان کے گھر جانے سے پہلے ہی تم تو دل شکستہ ہو رہے ہو۔ تمھارے بابا نے پہلے ہی ہتھیار پھینکے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہی ہے نا کہ وہ فیصلے سے پہلے ہی فتح حاصل کر چکے ہیں اور ہم اپنی ہار کا اعلان۔'' امی اسے اکسا رہی تھیں لیکن وہ خاموش تھا۔ اسے عاتی نے سچ مچ مایوس کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

امی جان، بابا اور منیب کے ساتھ جب چاچا میاں کے گھر گئیں تو وہ پہلے ہی سے اپنے ہتھیار تیز کیے بیٹھے تھے جبکہ دوسری طرف منیب اور بابا خالی ہاتھ اور خاموش تھے۔ امی جان کہاں تک ان کا تنہا مقابلہ کرتیں۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ ہانپنے لگی تھیں۔ اور بہت جلد ہی ان کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑ گئی۔ چاچا میاں اور چاچی بیگم نے فاتحانہ انداز میں چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پہلے سے منگوائی گئی مٹھائی سے ان کا ''منہ میٹھا'' کروایا گیا لیکن سوائے بابا کے امی جان اور منیب دونوں نے ہی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ سلطانہ تو فوراً کھڑی ہو گئیں۔ ان کی دیکھا دیکھی منیب اور بابا بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ تینوں خاموشی سے آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے کے دروازے تک پہنچے۔

''میں بہت جلد آپ کی طرف باقی معاملات طے کرنے آؤں گا، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ جتنی جلدی ہو اتنا ہی اچھا ہے۔'' چاچا میاں کی آواز ان تینوں کو سنائی دی تھی جو انھوں نے بابا کے یا شاید ان تینوں کو ہی سنانے کے لیے طنزیہ یا سنجیدگی سے کہی تھی۔ بابا نے جواب میں اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''مجھے آپ دونوں سے اتنی کم ہمتی کی امید نہ تھی۔ یعنی کہ حد ہو گئی، وہ بڑھ بڑھ کر کیا کیا بول رہے تھے اور ہم حق پر ہوتے ہوئے بھی اپنے دفاع میں کچھ نہ کہہ سکے۔ ٹھیک ہے کر لیں اپنی من مانی میں بھی دیکھتی ہوں۔ جتنے ڈرامے کرنے تھے کر لیے۔ اب میری باری ہے۔ اب یہ جو ''باقی معاملات'' طے کرنے یہ لوگ آئیں گے اس میں، میں ان کی ایک نہ چلنے دوں گی۔ اب بس وہی ہو گا جو میں چاہوں گی۔'' امی جان بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔ لیکن اس دفعہ بھی یہ ان کی خام خیالی تھی۔

☆......☆......☆

چند ماہ بعد ہی رافعہ نہ چاہتے ہوئے بھی امی جان کی بہو بن کر

ان کے گھر آ گئی تھی۔ وہ واقعی تیز اور ہوشیار لڑکی تھی لیکن اتنی بھی نہیں جتنی امی جان نے اس سے توقع کی ہوئی تھی۔ بہرحال گاڑی چل پڑی تھی۔ منیب کا رویہ اس کے ساتھ لاتعلقی والا ہی تھا۔ وہ اس کے کام کر دیتی تب بھی وہ چپ رہتا اور نہ کرتی تب بھی خاموش رہتا۔ چاچا کے گھر وہ بہت کم جاتا۔ چاچا میاں اب بھی اسی طرح اکڑتے رہتے، فتح کا احساس ان پر غالب ہی رہتا۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے گویا بے نیاز ہو گیا تھا۔ عاتی کے انکار نے اس پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔

☆......☆......☆

گھنٹی کی آواز پر عاتکہ نے بجلی کی سی تیزی سے دروازہ کھولا، رضوانہ بیگم، ابو اور بڑے بھائی گھر میں داخل ہوئے۔ عاتکہ، ابو اور بھائی کے چہرے کو کھوجتی نظروں سے دیکھنے لگی۔ لیکن وہ خاموشی سے اندر آ گئے۔ اس نے تینوں کو پانی پلایا اور چائے کا پوچھتی ہوئی کچن میں آ گئی وہ جلدی جلدی چائے بنا کر لے آئی۔ تینوں کے چائے ختم کرنے تک وہ مسلسل پہلو بدلتی رہی۔

''امی کیا کہا ڈاکٹر نے؟''

''ہاں ڈاکٹر نے کہا ہے کہ زیادہ خطرے کی بات نہیں آرام کریں ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔'' امی سے پہلے ابو نے اسے جواب دیا۔

''اوہ شکر ہے۔ امی آپ کو پتہ ہے میں کتنا ڈر گئی تھی۔ رات کو آپ کی طبیعت خراب ہونے کے بعد، جب سے دعائیں کر رہی ہوں۔'' عاتکہ برتن ٹرے میں رکھتی ہوئی بولی اور امی اس کے جواب میں صرف مسکرا دیں۔ وہ بیمار تھیں یہ وہ جان گئی تھیں چاہے میاں اور بیٹا کتنی طفل تسلیاں دیں۔ کچھ دیر بعد امی کمرے میں جا کر لیٹ گئیں اور وہ کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی تب ہی سہیل بھائی کچن میں آئے۔

''عاتی کیا پکا رہی ہو؟'' وہ فریج میں سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''چکن بنا رہی ہوں ساتھ میں دوپہر کو کٹلس بنائے تھے وہ ہیں۔'' وہ مصروف سے انداز میں بولی۔ لیکن چند لمحوں بعد ہی اس نے ٹھٹک کر بھائی کو دیکھا جو سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''بھائی کیا ہوا، کیا بات ہے، آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں'' وہ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ ''عاتی میں چاہ رہا ہوں کہ میں تم کو اندھیرے میں نہ رکھوں اور اصل بات بتا دوں تم سمجھدار ہو میرے خیال سے تم اس صورت حال کو سنبھال لو گی۔'' وہ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ کام کرتے اس کے ہاتھ رک گئے تھے۔ وہ سوالیہ نظروں سے بھائی کو دیکھنے لگی۔

''امی کے جو رات سینے میں درد اٹھا تھا، وہ معمولی نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ...... کہ یہ دل کی تکلیف ہے اور اس کا خیال ہے کہ ان کے دل کے دو والو خراب ہو چکے ہیں۔ اس نے بہت احتیاط کرنے کا کہا ہے اور فوری طور پر ان کی انجیوگرافی کا کہا ہے۔ میں یہ سب تم کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم پہلے سے ہی ذہنی طور پر تیار رہو اور اب امی کو بالکل کام کاج نہ کرنے دینا، اب ہمیں امی کی صرف ہاں میں ہاں ملانی ہے۔ ارے ارے۔'' سہیل نے دیکھا آنسو بڑی تیزی سے اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ ''میں نے تم کو اس لیے تو نہیں بتایا کہ تم......'' مگر اس سے آگے وہ خود نہ کہہ سکے عاتکہ ان کے بازو سے لگ کر بری طرح رو رہی تھی۔

''عاتی عاتی اپنے آپ کو سنبھالو، اس کا مطلب ہے کہ میں نے غلطی کی تم کو بتا کر۔''

''بھائی کیا امی............؟''

''امی کو کچھ نہیں ہوگا، اللہ بڑا کارساز ہے تم دعا کرو بلکہ ہم سب ہی دعا بھی کریں اور دوا بھی بس اب ان کو اچھی طرح دیکھ بھال کی ضرورت ہے، اب شاباش چپ کر جاؤ۔ ورنہ دیکھو اگر امی نے تم کو اس طرح دیکھ لیا اور پوچھا تو ان کو کیا جواب دو گی۔'' یہ سن کر وہ جلدی سے چہرہ دھونے واش بیسن کی طرف مڑ گئی۔

☆......☆......☆

اور پھر امی کی طبیعت ڈھتی چلی گئی۔ ان کی انجیوگرافی ہو چکی

تھی۔ جس میں واضح تھا کہ ان کے دو والو نے کام کرنا بند کر دیا تھا اور تیسرا بھی متاثر تھا۔ پچھلا پورا مہینہ اسی بھاگ دوڑ میں گزرا، ڈاکٹر نے انجیو پلاسٹی کا کہا تھا لیکن وہ زیادہ پرامید نہ تھا۔ امی بھی اب زیادہ تر خاموشی سے کمرے میں بند لیٹی رہتیں اور وہ اکیلی سارے گھر میں بولائی پھرتی۔ فوزیہ باجی آجاتیں تو گھر میں ان کے بچوں کی وجہ سے ذرا رونق ہو جاتی لیکن ان کے جانے کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی۔ دونوں بھائی اور ابو دن ڈھلے گھر آتے تو ذرا چہل پہل ہو جاتی۔ لیکن سب اپنے اپنے میں ہی مگن تھے بس ایک وہی تھی جو آنے والے وقت سے خوفزدہ رہتی۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ شاید امی کی بیماری میں اس کا قصور ہے کیونکہ اس کے انکار کے بعد ہی سے امی کا رویہ بھی اس کے ساتھ غیر محسوس طریقے سے تبدیل ہونے لگا تھا۔ حالانکہ انکار تو انھوں نے منیب کے چاچا کی ضد کے آگے اور ابو کے مشورے کے بعد ہی کیا تھا لیکن وہ اس انکار کے بعد کچھ بکھر سی گئی تھیں۔ منیب کو انھوں نے ہمیشہ اپنے بیٹے اور داماد کے روپ میں دیکھا تھا۔ اب ایک دم وہ کسی اور کا داماد بن جائے، بڑی مشکل سے انھوں نے یہ قبول کر کے اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔ منیب بھی شادی کے بعد صرف دو دفعہ ہی ان کے گھر آیا تھا۔ پہلی دفعہ ان کے دعوت کرنے پر اور دوسری دفعہ اکیلا ہی آ گیا تھا۔ اور اب تو اس کی شادی کو بھی کئی ماہ گزر چکے تھے۔ اس دوران عاتکہ کے دو رشتے آئے لیکن مناسب نہ ہونے کی وجہ سے امی کو خود انکار کرنا پڑا۔ اور پھر امی کی حالت سنبھل نہ سکی انھوں نے آپریشن کروانے سے صاف انکار کر دیا تھا اور بالآخر ایک رات وہ سوئیں تو صبح نہ اٹھ سکیں۔

عاتکہ کی تو سچ مچ دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ وہ کئی دن صدمے سے نڈھال رہی۔ فوزیہ اور اس کے دوسرے رشتہ دار اس موقع پر اس کے سہارا تھے لیکن کب تک، ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ فوزیہ بھی آج پندرہ دن بعد اپنا سامان بیگ میں رکھ رہی تھی وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فوزیہ کا اپنا دل کٹ رہا تھا لیکن کیا کرتی وہ خود میاں بچوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ میاں صاحب بھی اب اکتانے لگے۔ اس کا گھر سارا اوندھا ہو رہا تھا۔ بچوں کی اسکول کی کئی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ ساس بھی پریشان تھیں۔ وہ کب تک رہ سکتی تھی۔

''میں آتی جاتی رہوں گی۔ پڑوس کی خالہ اور افشاں باجی سے کہہ دیا ہے وہ تمھارا خیال رکھیں گی۔'' وہ بیگ کی زپ لگاتے ہوئے بے چارگی سے بولی۔ خود اس کو اور عاتکہ کو معلوم تھا کہ اس کا آنا جانا کتنا مشکل ہے۔ ان کا گھر امی کے گھر سے کافی دور تھا۔ پھر بچوں کی پڑھائیاں، اسکول، مدرسہ، اس کا آنا آسان نہ تھا۔ اسی لیے اس نے پڑوس کی باجی اور خالہ سے کہہ دیا تھا۔ عاتکہ نے جواب میں آہستہ سے سر ہلا دیا تھا۔

فوزیہ بھی چلی گئی، وہ تنہا ہوگئی اگرچہ اب ابو اس کی تنہائی کی وجہ سے دوپہر میں ہی گھر آجاتے اور چھوٹے بھائی شکیل نے بھی اپنی ڈیوٹی دیر سے کروالی تھی۔ وہ دس بجے کے بعد گھر سے نکلتا اور دو بجے تک ابو گھر آجاتے لیکن یہ چند گھنٹے بھی اس کو پہاڑ کے مانند لگتے۔ ایسا لگتا گھڑی کی سوئیاں ایک ہی مقام پر ٹھہر گئی ہیں۔ امی کا وجود اس گھر کی بنیاد تھا اور جب بنیاد ہی نہ رہے تو......

اب اگر اس سے کوئی شادی کی بات کرتا تو باپ بھائیوں کی وجہ سے انکار کر دیتی کہ ان لوگوں کو کھانے پینے کی تکلیف ہوگی، گھر کون سنبھالے گا۔ جب تک سہیل بھائی کی شادی نہیں ہو جاتی تب تک اس نے اپنی شادی نہیں کرنی تھی۔

☆......☆......☆

ابو کو شام کی چائے دے رہی تھی تب ہی دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا، منیب تھا۔ وہ اندر آیا تو ابو کے ساتھ اس نے اسے بھی چائے کی پیالی تھمائی۔ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ وہ خاموشی سے وہیں ایک کرسی پر ٹکی ان کی باتیں سنتی رہی۔ کچھ دیر بعد ابو اٹھ گئے تو وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ منیب نے ایک زخمی نظر سے اس کو دیکھا۔

''کیسی گزر رہی ہے؟'' کیسی کاٹ تھی اس کے لہجہ میں۔

''ٹھیک!'' وہ سامنے گملے میں لگے پودے کو گھورتے ہوئے بولی۔

''اب بھی گھر بسانے کا ارادہ ہے یا ساری زندگی یونہی تنہا گزار دو گی۔''

''میں نے کب کہا کہ تنہا گزاروں گی۔'' اس نے پودوں کی طرف سے نظر ہٹا کر اسے لمحہ بھر کے لیے دیکھا پھر واپس نگاہیں گھما لیں۔

''کیوں؟ اب تو تمھارے دونوں بھائیوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے تم مسلسل انکار کر رہی تھیں۔ اب تو وہ مسئلہ بھی ختم ہوا۔''

اور یہ سچ تھا امی کے انتقال کے بعد وہ بھائی اور ابو کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے انکار کر رہی تھی پھر امی کے انتقال کے تقریباً ایک سال بعد پہلے سہیل بھائی کی شادی ہوئی اور پھر چھوٹے شکیل بھائی کی بھی شادی خوش اسلوبی سے کر دی گئی۔ فوزیہ اور عاتکہ دونوں بہنوں نے بھائیوں کی شادی بڑی اچھے طریقے سے کی۔ دلہنوں کے لین دین کرنے میں کوئی کمی نہ کی کہ مبادا بھائیوں کو یہ محسوس نہ ہو کہ امی نہیں ہیں جو دلہنوں کے چاؤ کرتیں۔ دونوں بھائی شادی کے بعد اپنی بیوی بچوں میں مگن ہو گئے تھے۔ فوزیہ پہلے ہی کم آتی تھی، بھابیوں کے بعد پندرہ دن میں گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے آ کر مل جاتی اور رہے ابو جی تو وہ تو اب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے اپنی ہر ضرورت وہ عاتکہ سے کہتے۔ کئی بیماریاں ان پر حملہ آور ہو چکی تھیں۔ وہ بھی شاید اب کچھ خودغرض ہو گئے تھے۔ عاتکہ کی شادی کے بعد وہ بہوؤں کے محتاج ہو جاتے اور دونوں بہوؤں کے رویے کچھ اتنے اچھے بھی نہ تھے، وہ بڑھاپے میں رلیں یہ ان کو گوارا نہ تھا۔ اس لیے اب وہ بھی اس کی شادی کی طرف سے پہلوتہی کرنے لگے تھے۔ پچھلے دنوں فوزیہ ہی اس کا ایک رشتہ لائی جس کو سرسری سا دیکھ کر بھائیوں نے انکار کر دیا تھا کہ یہ ہماری ذات برادری کا نہیں۔ ابو نے بھی پھر بیٹوں سے باز پرس نہ کی اگرچہ فوزیہ نے ابو پر زور دیا تھا کہ رشتہ مناسب ہے شادی کر دیں لیکن جواب میں ابو خاموش رہے۔ پھر فوزیہ بھی غصہ میں آ گئی اور کہہ دیا کہ آئندہ وہ اس معاملے نہ پڑے گی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' منیب نے اس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں آں کچھ نہیں۔'' وہ جو اپنے باپ اور بہن بھائیوں کے رویوں کے بارے میں سوچ رہی تھی ایک دم چونکی۔

''عاتی، میں اب بھی تمھارا طلبگار ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں، تم ہاں کرو تو میں کل ہی امی جان کو خالو جان سے بات کرنے بھیجوں وہ بھی تمھیں بہو بنانا چاہتی ہیں۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اب آپ شادی شدہ ہیں، اور میں نے جب ہاں نہ کی تو اب کیسے کر سکتی ہوں، صبا اب بھی آپ کی منتظر ہے، سنا ہے اس نے دوبارہ خودکشی کی کوشش کی ہے لیکن شاید خدا کو اس کی زندگی منظور ہے جو وہ دونوں دفعہ بچ گئی۔''

''آخر تم کو مجھ سے زیادہ صبا سے کیوں ہمدردی ہے۔ وہ بے وقوف لڑکی ہے، جنونی اور پاگل، اس کی کسی بھی حرکت کا میں ذمہ دار نہیں۔ تم نے پہلی بار بھی مجھے اسی سے شادی کرنے پر قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''ہاں وہ پاگل لڑکی آپ سے شدید قسم کی محبت کرتی ہے وہ کہتی ہے کہ اگر وہ آپ کی نہیں ہو سکتی تو کسی کی بھی نہیں ہو گی۔ اس جنونی نے اسی لیے خودکشی کی کیونکہ اس کے گھر والے اس کی مرضی کے برخلاف اس کی شادی کر رہے تھے۔''

''آخر ہر کوئی مجھے خودکشی کی دھمکی کیوں دیتا ہے کیا ان کی زندگی اتنی ارزاں ہے؟''

''پتہ نہیں ان کی زندگی اتنی ارزاں ہے یا آپ بہت قیمتی اور نایاب ہیں کہ لوگ آپ کو حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دیتے ہیں۔'' وہ سامنے پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی جو واپس اب اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے۔

''کیا آپ واقعی دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں؟'' عاتکہ نے لوٹتے پرندوں سے نظریں ہٹا کر منیب سے پوچھا۔

''ہاں! تم سے، تم بے جا ضد چھوڑو، صبا جیسی بے وقوف لڑکی کے پیچھے اپنی زندگی نہ برباد کرو، میں ایک شادی کر کے پہلے ہی بہت ناخوش ہوں۔ ایک ضد کی بھینٹ چڑھ چکا اسے نباہ رہا ہوں، اب

دوبارہ ٹھوکر کھانے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔‘‘

’’صبا بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں، وہ آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔‘‘

’’بس، بہت ہوگئی۔ ایک دفعہ پہلے بھی تم نے اس کی وکالت میں بہت دلائل دیے تھے۔تم نے صبا کی خاطر مجھے انکار کیا تھا، کیا مل گیا تمھیں انکار کر کے۔سوائے پچھتاوے کے۔‘‘

’’آپ کے چاچا نے بھی تو کیسی کڑی شرط رکھ دی تھی، آپ اس کے آگے مجبور تھے۔‘‘

’’میں کوئی مجبور نہیں ہوا تھا، اگر تم میرا ساتھ دیتیں تو میں چاچا میاں کو صاف جواب دے دیتا لیکن تم نے تو صبا کے حق میں دلائل دے دے کر مجھے توڑ دیا تھا، تمھاری طرف سے مایوس ہو کر ہی میں نے چاچا میاں کے آگے ہار مانی تھی۔‘‘ وہ اسے یاد دلا رہا تھا بلکہ جتا رہا تھا۔

’’آپ جانتے تو ہیں میری عادت، ہمیشہ سے اپنا حصہ دوسرے کو دے دینا، دوسروں کی خاطر اپنا نقصان کر لینا، آپ میری حساس طبیعت سے کیا واقف نہیں؟ اور آپ سے کس نے کہا کہ میں پچھتا رہی ہوں، پچھتاتی تو شاید دوسری صورت میں، مگر صبا کے جذبات کا علم ہونے کے بعد میں کبھی آپ سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ ورنہ میں خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گی اور نہ ہی خود کو کبھی معاف کر پاؤں گی۔ یہی بات پہلے بھی میں نے کہی تھی اور آج پھر کہہ رہی ہوں۔‘‘ وہ اپنے ہاتھوں کو گھورتے ہوئے بولی۔

’’تمھیں ہر ایک کا خیال ہے، سوائے میرے، اور میں کوئی چیز نہیں جو تم کسی کے مانگنے پر اس کے حوالے کر دو گی۔‘‘ وہ دبی آواز لیکن کاٹ دار لہجے میں کہہ رہا تھا۔

’’خالہ کو بھی نہ جانے تم نے کیا کہہ کہہ کر اپنا ہم نوا بنالیا تھا۔‘‘ وہ پچھلی باتوں کو دہرا رہا تھا۔

’’اب ان باتوں سے کیا حاصل۔ آپ میری فکر چھوڑ دیں، میری فکر کرنے والے ابھی بہت ہیں۔‘‘

’’ہاں مجھے خوب اچھی طرح نظر آ رہا ہے۔‘‘ اسے عاتکہ کے گھر کے حالات کا بخوبی علم تھا۔ وہ جواب میں صرف ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر آخر کار اٹھ کر چلا گیا اور وہ اس کے نقش پا دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

آج فوزیہ آئی ہوئی تھی۔ وہ کافی دن کے بعد آئی تھی۔ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک فوزیہ کو یاد آیا۔

’’ارے سنا عاتکہ تم نے، منیب کی خالہ جان دوسری شادی کر رہی ہیں شمسہ کی نند صبا سے، میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا یہ کیا ہو رہا ہے۔ سنا ہے اس لڑکی نے تو دو دفعہ خودکشی کی کوشش بھی کی ہے۔ ویسے بھی منیب کہاں پہلی بیوی سے خوش ہے چلو دیکھتے ہیں دوسری کیسی رہتی ہے۔ ارے بھئی اچھا ہوا جو ہم نے انکار کر دیا تھا۔ اب اگر وہ تم پر سوکن لے آتا تو تم کہیں کی نہ رہتیں۔‘‘

فوزیہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی لیکن عاتکہ جانتی تھی ایک نہ ایک دن یہ ہونا تھا۔ پہلی دفعہ اگر منیب چاچا کی وجہ سے مجبور تھا تو اس دفعہ شمسہ نے جو منیب کے ماموں کی بیٹی تھی اپنا گھر بچانے کے لیے منیب کو واسطے دے دے کر مجبور کیا ہوگا کیونکہ صبا کے گھر والے اس کی زندگی چاہتے تھے تو صبا کو منیب چاہیے تھا...... ہر صورت میں! اور شمسہ نے میاں کی طلاق کی دھمکی سے خوفزدہ ہو کر منیب کے آگے ہاتھ جوڑ کر اسے راضی کر لیا تھا۔

اور منیب ...... اس نے ایک دفعہ پھر ہار مان لی تھی۔ اس کی زندگی شاید اسی طرح دوسروں کی زندگیوں سے جڑی ہوئی تھی۔ جس نے چاہا اپنی طاقت دکھا کر اس کو کمزور کر دیا، قربان گاہ پر لٹا دیا۔

فوزیہ تو نہ جانے ابھی اور کیا کہتی کہ باہر بچے کے رونے کی آواز سن کر کمرے سے نکل گئی۔ عاتکہ جو الماری میں کپڑے رکھ رہی تھی آنکھوں میں چھائی دبیز دھند کو صاف کرنے لگی۔

وہ اور منیب دریا کے دو کناروں کے مانند تھے جو ساتھ رہتے ہوئے بھی مل نہ سکتے تھے۔ وہ تو اس حقیقت کو تسلیم کر چکی تھی اب شاید منیب نے بھی اس کو قبول کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

رب کا شکر ادا کر بھائی!

تعلق کے نازک دھاگوں سے بندھے ایک انوکھے سفر کا تبسم ریز حال

''لہور لہور اے'' کا احساس قلب و جان پر حاوی تھا۔ زندہ دلانِ لاہور نے ادبی لوگوں سے ملاقات کروا کے میرا لہو گرما دیا تھا اور خلوص و محبت کی جو پوٹلیاں ہر فرد اور ہر گھر سے حاصل ہوئی تھیں ان کو رکھنے کے لیے دل میں بھی خود بخود وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ دل محبتیں پا کر کیسے کِھل جاتا ہے...... جیسے ننھی سی کلی پھول بن جاتی ہے! اور مجھے لاہور کو الوداع کہنا تھا۔ میرا اگلا سٹاپ مری تھا۔

میرے شوہر نے فون پہ ہدایت کی (جو کہ خود مری میں تشریف رکھتے تھے) ''لاہور سے بس پکڑو اور پنڈی فیض آباد پہنچو، وہاں سے وین لو جو کہ چند قدم کے فاصلے سے مل جائے گی اور بس آرام سے مری آ جاؤ۔''

ان کی حاکمانہ سی معلومات کو سنتے سنتے میں نے فیض آباد بس سٹاپ پر دو بیگ اٹھائے چند قدم چلنے کا تصور کیا اور کہا۔

''میں اس بس پہ آؤں گی جو سیدھی مری آتی ہوگی۔''

ان کی طرف سے بہادری کے جذبات کو ابھارنے اور عورت کی کمزوری کا احساس دلانے والے لہجہ میں ارشاد ہوا۔

''مرد بنو۔''

میں نے مردانہ زندگی کی ناہمواریوں کا سوچا اور کہا۔

''ٹھیک ہے، میں مرد بن جاتی ہوں۔ آپ عورت بن جائیں۔''

''کیوں؟ میں کیوں عورت بن جاؤں؟'' مردانہ آواز میں مردانگی کی انا کو ٹھیس پہنچنے کا احساس غالب تھا۔

''کیونکہ جوڑی تو مرد اور عورت سے ہی بنتی ہے۔'' میں نے رسان سے جواب دیا۔

''اچھا بھ......ئی'' (بھئی کہتے ہوئے مارے شدت کے انہوں نے ''بھا'' کو ذرا زیادہ ہی لمبا کر دیا جو بھائی بن گیا) ''جو مرضی آئے کرو۔''

''اچھا، بہن جی! وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہوگا۔'' میں نے بھی ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔

پھر اللہ کو یہ منظور تھا کہ میں فیض آباد ہی جاؤں کیونکہ براہ راست مری جانے والی بس کا وقت سفر کے لئے مناسب نہ تھا۔

بارہ بجے بس لاہور سے روانہ ہوئی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی جو سارا راستہ جاری رہی کہیں کم کہیں زیادہ۔

سفر میں جب بھی کھیتوں کھلیانوں کو دیکھتی ہوں تو بنت الاسلام مرحوم کے ناول ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی'' کا ایک سین یاد آ جاتا ہے کہ جب ایک ٹیچر ان کھیتوں، کارخانوں کو کلام الٰہی کی پھونک سے فیض یاب کر رہی ہوتی ہیں اور میں بھی اپنے پیارے پاکستان کی پیاری سرزمین کے لہلہاتے کھیتوں، بہتے دریاؤں، زمین و آسمان کے لئے خیر کی دُعا مانگتی رہتی ہوں۔

کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ یہ سب نعمتیں حکمرانوں کے لئے مخصوص ہیں۔ عام آدمی تو ان فیکٹریوں اور کھیتوں میں اپنا خون پسینہ بہانے کے لئے ہے اور اس پسینے کے خشک ہونے سے پہلے مزدوری حاصل ہوتی بھی ہے یا نہیں؟

پتہ نہیں یہ حکمران اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر ایک ایک پیسے اور دانے اور ایک ایک لمحے کا حساب دینے سے نہیں ڈرتے؟ پھر میں نے دل کو تسلی دی کہ حکمران حساب دیں گے اور عوام بے حساب جنت میں جائیں گے۔ میں نے دماغ میں آئی سوچ کو دل تک جانے سے روکا کہ عوام بھی تو قصوروار ہیں!

پتہ نہیں اس ظالم معاشرے میں ظلم کی چکی کہاں کہاں اور کس کس کو پیس رہی ہے۔ میرے دل میں درد ہونے لگا۔ دل کو بہلانے کے

لیے میں نے اپنی ہم نشین کو دیکھا۔

میرے ساتھ میڈیکل کالج کی طالبہ اپنی موٹی موٹی کتابوں کو ادل بدل کر پڑھ رہی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں مستقبل کی ڈاکٹر کو خدمت خلق کے جذبے پر استقامت کی دُعا دی۔ یہ دُعا میں نے معمول کے ڈاکٹری جذبات کے مدنظر دی تھی جو سال چہارم تک آتے آتے معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر ان کے مستقبل کی دُعا کرنا ایک مجبوری بھی ہے۔ اس لئے کہ اپنی قوم کا مستقبل روشن رکھنے کیلئے ہم دُعا ہی کر سکتے ہیں۔

فیض آباد پہنچے تو تیز بارش ہو رہی تھی۔ بس والے بھائی سے پوچھا کہ مری جانے کے لئے وین کہاں سے ملے گی؟ اس نے بس کی ڈگی سے میرے دو بیگ نکالے اور کمال مہربانی سے مشورہ دیا۔

''خالہ جی، آپ یہ پاس ہی ہمارے ویٹنگ روم میں بیٹھیے۔ ابھی کوئی لڑکا آپ کی مدد کر دے گا۔''

وہ میرے دونوں بیگ اٹھا کر مجھے ویٹنگ روم میں بٹھا گیا اور پھر پلٹ کر نہ آیا۔ اسی اثناء میں میرے شوہر نامدار کا فون آیا۔

''کہاں ہو؟''

''ویٹنگ روم میں''

''کیا کر رہی ہو؟''

''انتظار۔''

''کس کا؟''

''وین کا''

''موسم کیسا ہے؟''

''شدید بارش ہے۔''

''اچھا مری میں بھی خوب برف پڑ رہی ہے۔'' بچوں کی طرح چہکتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

پھر ان کو یاد آیا کہ میں مسافر ہوں۔ ''اچھا میں نے تمہارے لئے بڑا اچھا انتظام کر دیا ہے۔ تمہارے لئے ایک سرپرائز ہے۔'' میرے میاں کو سرپرائز دینے کا بہت شوق ہے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وہ میرا استقبال کرنے فیض آباد تک آ گئے ہوں گے۔

''اچھا...... وہ کیا؟''

''محسن واہ کینٹ سے مری آ رہا ہے۔ اسے کہتا ہوں کہ تمہیں فیض آباد سے ساتھ لے لے۔ تم اس کا وہیں انتظار کرو۔''

یہ انتظار کا لفظ اور کیفیت ''بیوی'' کے نصیب میں لکھی ہوئی ہے۔ اور میں نصیب یعنی انتظار میں مبتلا ہو گئی۔ محسن بھائی کا بھی فون آ گیا کہ ''چلنے لگے ہیں۔'' ان کے خیر سے پہنچنے کی دُعا کی۔

زنانہ ویٹنگ روم چھوٹا سا تھا۔ بیٹھنے کی جگہ مناسب تھی، ہیٹر بھی لگا ہوا تھا۔ دو خاندان پہلے سے براجمان تھے اور ان میں سے ایک عوامی جگہ کو اپنی خاص ملکیت سمجھ کر مصروفِ کار تھا۔ ملتان سے آئی ہوئی یہ فیملی اسلام آباد کی سیر کر کے واپس جانے کے مرحلے طے کر رہی تھی۔ ویٹنگ روم ان کے گھر کا لاؤنج لگ رہا تھا۔ کرسیوں پر پھیلے کپڑے، کھانے کی پلیٹیں، چائے کا تھرمس، ادھر اُدھر پڑا تھا۔

چار سال کی بچی دو ڈھائی سال کا بچہ...... اور ماں جو بلند آواز اور کرخت لہجہ میں بچوں کی تربیت فرما رہی تھیں رواں تبصرے کے ساتھ پہلے بچی کو شوخ وشنگ گوٹے کناری والے کپڑے پہنائے گئے جیسے کہ ابھی شادی میں شریک ہونے جا رہی ہوں۔ پھر باقاعدہ نیل پالش لگائی گئی اور بچی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے کاجل اور نیل پالش لگوانے کے آداب سکھائے جاتے رہے۔ لپ اسٹک لگا کر بچی اپنے ہونٹوں کو ایسے سکیڑ کر بیٹھ گئی کہ ذرا سا ہونٹ ہلیں گے تو لپ سٹک نیچے گر جائے گی۔ اس کیفیت میں بیٹھی بچی کو دیکھ کر ماں نے زور سے قہقہہ لگایا اور بہت نامناسب سا تبصرہ کیا اور بچی کو لپ اسٹک لگا کر بیٹھنے کے آداب سمجھائے۔ ساتھ بیٹھی خاتون جو کہ خاموش اپنے خوابیدہ شاید بیمار چھ سال کے بچے کو گود میں سمیٹنے کی تگ ودو کر رہی تھیں، بچی کی ماں کے متوجہ کرنے پر چونکیں۔

''میرے بچے بہت ذہین ہیں۔ ہر وہ کام کرتے ہیں جو بڑے کرتے ہیں۔ میں خود میک اپ سے پہلے اس کا نہ کروں تو طوفان مچا دیتی ہے۔''

وہ خاتون پھر بھی کچھ نہ بولیں۔ بچے کو گود میں سمیٹنے کی مزید کوشش

کرنے کے لئے یا ان کی طرف سے بے رخی کا اظہار کرنے کے لئے دائیں سے بائیں طرف مڑنے کی کوشش کی مگرنا کام رہیں۔

میرے مسلسل جائزہ لینے کا احساس ان خاتون کو ہو گیا اور وہ میری طرف متوجہ ہو گئیں۔ ''بچوں کو کبھی دوسروں سے کم تر ہونے کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔'' ساتھ ہی اپنے بیگ کو گھسیٹ کر قریب کیا۔

''میں اپنا لیپ ٹاپ ہمیشہ ساتھ رکھتی ہوں پتہ نہیں کہاں بچے ضد کرنے لگیں کارٹون دیکھنے کی۔'' آواز اس قدر تیز تھی کہ کانوں کو گراں گزری۔

میں نے تکلفاً مسکرانے کی کوشش کی مگر ان کے کٹیلے لہجے، تیز آواز اور اندازِ مسافری پہ احتجاج کی خاطر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا کہ مسکرانا تعلقات کی ابتدا ہوتا ہے اور یہ مسکراہٹ مہنگی پڑ سکتی ہے مجھے ابھی نہ جانے یہاں اور کتنا انتظار کرنا تھا۔ میری اس بداخلاقی کا ان کے مضبوط اعصاب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ اپنی دور اندیشی پر داد لینے کی کوشش کرتی رہیں۔

لیپ ٹاپ پہ کارٹون لگا کر بچی کے سامنے رکھا تا کہ وہ بار بار گیلی زمین پر نہ اترے۔ موسیقی کی آواز سن کر چھوٹا بچہ اٹھ گیا۔ ماں نے اس کے جلدی اٹھنے اور اپنے اندازے کے غلط ہونے اپنا بناؤ سنگھار ملتوی ہونے بچے کو زور سے دھپ لگائی اور خود کو بھی کوسا گویا کہ لاؤڈ اسپیکر کام کر رہا تھا دونوں ماں بیٹے کا۔

بھائی محسن کا فون آ رہا تھا میرے موبائل کی آواز نے مجھے چونکایا۔

''باجی، بارش کی وجہ سے کچھ دیر ہو جائے گی۔ وین کی رفتار بہت کم ہے۔''

''اچھا...... دیر سے پہنچنا، نہ پہنچنے سے بہتر ہے۔'' میں نے پھر سے خیریت سے پہنچنے کی دُعا کی۔ آیت الکرسی اس ساری وین کے لئے پڑھ کر اندازے سے پھونک دی جس میں میرا بھائی اور آمنہ بھابھی بیٹھے تھے۔

پھر موبائل بول اٹھا۔ میرے سرتاج میری فکر میں دبلے ہو رہے ہوں گے یقیناً......

''فون کیوں بزی تھا؟''

''محسن کا فون تھا''

''ابھی آیا نہیں محسن؟''

''نہیں، بارش کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔''

''تو پھر خود ہی آ جاؤ، اب تک پہنچ بھی جاتی۔''

''اب اتنا انتظار کر لیا ہے تو تھوڑا اور سہی۔''

مجھے اتنی تیز بارش میں باہر نکل کر وین تلاش کرنا اور دو بیگ کا ساتھ ہونا زیادہ گراں لگ رہا تھا۔ ویٹنگ روم میں آوازوں کا پیمانہ جتنا بھی اونچا ہو چھت کا ہونا نعمت ہے۔

میں نے اس عارضی ترین ٹھکانے میں انتظار میں مبتلا رہنے کا اندازہ لگایا کہ کم از کم چالیس منٹ مزید لگیں گے۔ مگر دس منٹ بعد ہی محسن کی گھمبیر آواز میں ''السلام علیکم'' نے کانوں کے ذریعے دل کی ڈھارس بندھائی۔

ان سب آوازوں میں بھائی کی آواز کیوں اتنی بھلی لگی؟ واہ! میرے اللہ کیا رشتے ہیں اور کیا احساسات ہیں......سبحان اللہ!

آمنہ نے جلدی سے میرا پرس پکڑا۔ محسن نے دونوں بیگ اٹھائے اور ہم ویٹنگ روم سے باہر نکلنے لگے، جاتے جاتے میں نے باقی ''منتظرین'' کو سلام کیا، دل میں بچی کی ماں کے لیے میٹھے لہجے والی ''بہترین ماں'' بننے کی دُعا کی، اور ایک ''آوازوں میں کرخت آواز والی'' مخلوق کو یاد کیا۔ معاف کیجئے گا، میں نے جان بوجھ کر یاد نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال خود بخود آ گیا تھا۔ آمنہ نے اپنی چھتری مجھے پکڑائی اور ہم تینوں بھیگتے بھاگتے مری جانے والی وین میں جا بیٹھے۔

ڈرائیور نے مسافروں کی تعداد پوری ہونے پر وین چلائی۔ فیض آباد سے نکل کر مری روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ سترہ کلومیٹر دور گئے تھے کہ پتہ چلا برف باری زیادہ ہے۔ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے سڑک بند ہو گئی ہے۔ آگے جانا مشکل ہے۔ رات چھانے کے باوجود چونکہ بھائی ساتھ تھا تو کوئی فکر اور پریشانی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے محترم رشتوں کا حصار عورت کو دے کر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

ڈرائیور نے دوسرے راستے سے مری جانے کا ارادہ کر لیا اور اس راستے پر رواں دواں ہوئے پہاڑ چڑھتے ہی برف نے استقبال کیا۔ یہاں بھی گاڑیوں کی لمبی لائن تھی جو رینگ رہی تھی۔ دم بدم چاروں طرف سفیدی چھا رہی تھی۔ اتنی تیزی سے برف گرنے کا منتظر بے حد

خوبصورت تھا۔ ہم جیسے مسافروں کیلئے ہر منظر سہانا ہے۔ صحرا، اور صحرا کا خوبصورت ستاروں بھرا آسمان، سمندر کی وسعت، دریا کی روانی، پہاڑوں کی ہیبت، کھیتوں کی تازگی، باغوں کی بہار، ہوائی جہاز کا بادلوں میں اڑنا، بحری جہاز اور کشتیوں کا پانی کی لہروں سے کھیلنا، سڑکوں پر دوڑتی گاڑیاں، ٹرین کی چھک چھک، گھوڑا گاڑی کی ٹک ٹاپ، ان سب کا تجربہ کیا تھا، برف کے پہاڑ بھی دیکھے تھے لیکن آج اس مختصر سفر کی طوالت نے تیزی سے گرتی برف کا جو منظر دکھایا وہ ایک انوکھا تجربہ تھا جو محسوس تو کیا جا سکتا ہے بیان کرنا مشکل ہے۔ جب ہماری سواری دوسرے متبادل راستے پہ جانے کے لئے واپسی کا سفر طے کر رہی تھی تو میرے میاں کا فون آیا۔

’’کہاں تک پہنچے؟‘‘

’’کہیں نہیں وہیں پہ ہیں‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’کسی حادثے کی وجہ سے سڑک بند ہے واپس جا رہے ہیں۔‘‘

’’کہاں‘‘

’’کوئی اور راستہ تلاش کرنے، آپ پریشان نہ ہوں، ہم پانچ چھ گھنٹے میں انشاء اللہ پہنچ جائیں گے۔‘‘ میں نے ان کی لمبی تسلی کرانے کی کوشش کی۔ پانچ چھ گھنٹے کا سن کر آمنہ بُری طرح چونکی۔ ’’باجی کیا کہہ رہی ہیں آپ ابھی تو سات بجے ہیں۔‘‘

’’ہاں تو بارہ بجے کے بعد انشاء اللہ پہنچ جائیں گے۔ ان حالات میں ایسے ہی ہوتا ہے۔‘‘

اور پھر میں شانت ہوگئی کہ اگلے چند گھنٹے اس انوکھے اور خوبصورت تجربے کیلئے کافی ہیں۔ میرے میاں حالات کی نزاکت جاننے کے لیے محسن کو بار بار فون کر رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا ہوگا کہ خود وہاں آ جائیں کیونکہ وہ آسان کام کو بھی مشکل بنا کر کرنے میں لطف لیتے ہیں اور کوئی مشکل مرحلہ ہو اور وہ منظر سے غائب ہوں ان کے لئے کافی احساسِ محرومی ہوتا ہے۔

لوئرٹوپہ آ کر وین والے نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ باہر تیز رفتاری سے مگر خاموشی اور سکون کے ساتھ برف باری جاری تھی۔ ہر طرف سکوت تھا، پاکیزہ، ستھری ونتھری سفید جھاگ نرمی کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے وین کے شیشے سے اس ماحول کو دیکھا جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کی بارش ہو رہی ہو۔ چاروں طرف روئی کے گالے اڑ رہے تھے اور روحانی ونورانی سا احساس دل کی ویرانی میں سکون لا رہا تھا۔

’’اے اللہ! میرے مالک! تیری اتنی تعریف کہ جتنی یہاں گرتی برف کے گالے ہیں۔ اور آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی امت پہ اتنی رحمت و برکت جتنے کہ اس برف کے گالے ہیں۔‘‘

مسافر آپس میں مشورے کر رہے تھے۔ ساری وین میں ہم دو خواتین تھیں۔ ہماری وجہ سے وین والا اپنی گاڑی کو تھوڑا اور آگے لے جانے پر راضی ہوگیا۔

محسن نے وہاں جا کر کسی اور پرائیویٹ گاڑی والے سے بات کی اور ہمیں وین سے اس گاڑی میں منتقل کرنے کیلئے چند گز چلنا پڑا وین سے باہر نکلتے ہی پورے ماحول پر نظر پڑی تو دل یکدم اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کی وحدانیت پر مزید یقین ہوگیا۔ ایک ناقابل بیان ایمانی ٹھنڈک دل میں اتر گئی۔ چند گز کا فاصلہ مزید گھنٹے لگا کر طے ہوا۔ مقامی آدمی نے کمال مہارت سے گاڑی چلائی اور ہمارے گھر کے قریب اتار دیا۔ رات کے اندھیرے میں روشن سا ماحول حالانکہ نہ چاند نہ سٹریٹ لائٹس۔ برف اور وہ بھی اتنی تازہ......اس کی روشن سفیدی نے آنکھوں کو طراوٹ بخشی اور دل کو طمانیت۔ ماحول کے سکون نے سفر کی طوالت کا احساس نہ ہونے دیا۔ گھر کا راستہ کافی نشیب میں ہے۔ برف پہ پاؤں رکھتے تو ایک فٹ اندر دھنس جاتا اور نرم سا احساس خوشی کی لہر دوڑا دیتا چونکہ علم تھا کہ ہمارے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہ سہی، مگر کوئی نقصان دہ رکاوٹ یا گڑھا بھی نہیں ہے، اس لئے مردانہ وار برفانی راستے کو طے کرتے گھر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ (الحمدللہ)

رات کے ساڑھے بارہ بجے میرے میاں نے سگھڑ عورتوں کی طرح گرم گرم چائے تیار کر رکھی تھی۔

رب کا شکر ادا کر بھائی

جس نے ہماری جوڑی بنائی

☆......☆......☆

آمنہ راحت (بریڈفورڈ)

تماشائے صبح وشام

لندن کے چکا چوند نظاروں میں گزرے ہوئے چند شب و روز کا احوال

اللہ کے فضل سے آصف کی کاروباری مصروفیات عروج پر تھیں۔ فروری اور مارچ میں ان کے کم و بیش نصف درجن کنٹینزوں نے برطانیہ کی مختلف بندرگاہوں پر لنگرانداز ہونا تھا۔ یوں سمجھئے کہ ان کو سر کھجانے کی فرصت بھی نہ تھی۔ پچھلے دو سال سے ہم اکثر و بیشتر سیر وسیاحت کا پروگرام بناتے مگران کی کاروباری مصروفیات کے باعث تفریح کا خواب شرمندہ تعبیر ہوئے بغیر ہی انجان راہوں میں کہیں کھو جاتا اور ہم ایک بار پھر روزمرہ کی مصروفیات میں سرگرداں ہو جاتے۔

اللہ نے جب سے ہمارے گھر نعمت کے بعد رحمت اتاری تھی میری گھریلو مصروفیات میں بھی قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ میرا بیٹا ہادی بریڈفورڈ کے لِلی کرافٹ نرسری اسکول میں نرسری جماعت کا طالبعلم ہے۔ اسکول سے گھر آ کر ننھا برخوردار کھیل کود اور شرارتوں میں مصروف ہو جاتا جبکہ میری بیٹی فارعہ جو ابھی پانچ ماہ کی ہے وہ غم ہائے روز و شب سے بے نیاز زندگی گزار رہی ہے۔ کبھی کھیلتی تو کبھی بھوک سے رو پڑتی۔ نیپی بدلنے سے تازہ دم ہوتی تو جھولا جھلانے سے نیند میں چلی جاتی۔ میں ہادی کو اسکول سے لینے جاتی تو تازہ ہوا میں ہشاش بشاش ہو جاتی اور جب گھر لوٹتی تو امور خانہ داری اور بچوں کی دیکھ بھال میں مگن ہو جاتی۔ گویا سب اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

ایک روز آصف نے کاروباری دورے پر لندن جانے کا عندیہ ظاہر کیا۔ یہ سننا تھا کہ دل کے کسی گمنام گوشے میں موجود سیاحت کی ننھی کرن یک دم جگمگانے لگی اور برسوں سے دل میں مقید نئی راہوں کا سفر کرنے کی تمنا شرمندہ تعبیر ہونے کو پر تولنے لگی۔ آخری مرتبہ ہم نے لندن کا سفر دسمبر ۲۰۱۲ء میں کیا تھا یعنی تقریباً ۲ سال قبل۔ دارالحکومت برطانیہ میں سیاحوں کیلئے کئی خوبصورت اور دلچسپ مقامات موجود ہیں۔ گزشتہ سفر میں ہم نے لندن کے چند مقامات کی سیر کی تھی۔ لہٰذا بقیہ مقامات کو دیکھنے کی آرزو ابھی دل میں باقی تھی۔ آصف نے اپنی کاروباری مصروفیات میں سے تین دن کا انتخاب کیا۔ جن میں ہفتہ اتوار اور پیر شامل تھے۔

ہادی کو کچھ کارٹونی کرداروں میں بے حد دلچسپی تھی۔ مثلاً مکی ماؤس، ڈونلڈ ڈک اور ہیزی ہگل مانسٹرز وغیرہ۔ میں نے جب انٹرنیٹ پر متلاشی نظریں دوڑائیں تاکہ ان تفریحی مقامات کو منتخب کر سکوں جہاں ہادی بھی خوب محظوظ ہو سکے تو میری نظر حیرت کدہ ٹیلفورڈ پر پڑی۔ میں نے اس کا ذکر آصف سے کیا تو انہوں نے وہاں کی ٹکٹ خریدنے کیلئے ویب سائٹ پر دیئے گئے ٹیلیفون نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہاں ٹیپ چل پڑی جس میں کوئی خاتون بتا رہی تھی کہ یہ سیرگاہ صرف مارچ کے ویک اینڈز پر کھلی ہے چونکہ ہمیں فروری کے اخیر میں لندن کے سفر پر نکلنا تھا۔ لہٰذا اس تفریح گاہ کی سیر کو کسی مناسب موقع کے لئے مؤخر کر دیا۔ میں مستقل کسی مناسب ہوٹل یا اپارٹمنٹ کی تلاش میں مختلف ویب سائٹوں کے چکر لگا رہی تھی۔ کہیں تو کمروں کی قیمتیں آسمانوں کو چھو رہی ہوتیں تو کہیں تمام کمرے بک ہو چکے ہوتے۔ اتنے کم وقت میں رہنے کی اچھی جگہ ڈھونڈنے میں دشواری نے مجھے مایوس کر رکھا تھا۔ جمعہ کی شام کو آصف نے بھی ویب سائٹوں پر کسی مناسب ہوٹل کی تلاش شروع کی تو ان کی نظر "Stay City Serviced Apartments" پر پڑی۔

جب تک ہادی دو سال کا تھا ہم دورانِ سفر بآسانی ایک کمرے میں رہ لیا کرتے تھے۔ مگر ہادی کے بڑے ہونے اور فارعہ کے ہماری فیملی میں شامل ہونے کے بعد ہمیں کسی ایسی جگہ رہائش کی ضرورت تھی جس میں کمرے اور بیٹھک کے ساتھ ساتھ باورچی خانہ بھی موجود ہو تاکہ نہ ہی کھانے پینے کی مشکل ہو اور نہ ہی ہادی کو کھیلنے کودنے میں تنگی

ہو۔ گویا یہ اپارٹمنٹ ہمارے لئے بے حد موزوں تھے چنانچہ آصف نے فوراً ہی یہاں کی بکنگ کرادی۔

جب تفریحی مقامات کی سیر کا ارادہ کیا تو ان کی ٹکٹ وہیں جا کر لینے کا ارادہ کرلیا کیونکہ لندن کی بے ہنگم ٹریفک اور بچوں کی مصروفیات کے باعث وقت کی پابندی ہمیں نسبتاً دشوار محسوس ہو رہی تھی جو کہ ان سیاحوں کو کرنی پڑتی ہے جو پہلے سے ہی ان مقامات کی ٹکٹ خرید لیتے ہیں۔ عمومی طور پر ہم ہفتے کے دن ہفتہ وار خریداری کرتے ہیں۔ ہفتے کو علی الصبح لندن کی جانب رختِ سفر باندھنے کا ارادہ بھی تھا اور ابھی پیکنگ اور خریداری سب باقی تھا۔ میں نے بھاگم بھاگ جمعہ کی رات کپڑے استری کیئے، سامان سمیٹا جبکہ کھانے پینے والی اشیاء اور ضرورت کی چھوٹی موٹی اشیاء کو ہفتے کی صبح کے لئے ملتوی کردیا۔

اگلے دن صبح فجر کے بعد آصف خریداری اور گاڑی میں پٹرول بھروانے کی غرض سے روانہ ہوئے تو میں نے افراتفری میں چیزیں بھی سمیٹیں اور بچوں کو بھی تیار کیا۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر ہم سب گاڑی میں جا بیٹھے۔ اتنی مدت بعد سیاحت وتفریح کے خواب کی تکمیل بے انتہا فرحت ومسرت کا باعث تھی۔ لندن ہمارے گھر سے اندازاً چار گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ ہنستے ہنساتے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور تقریباً آدھا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ بھوک کی شدت سے مجبور ہوکر ہم نے موٹروے پر قائم ''قیام وطعام'' کا بورڈ دیکھا تو کچھ دیر رک کر تازہ دم ہونے اور بھوک نمٹانے کا ارادہ کیا۔ وہاں برگر کنگ سے حلال فِش برگر اور چپس کھائے۔ تقریباً 5 بجے ہم لندن کے مضافات میں داخل ہو چکے تھے۔ ہماری نیوی گیشن ہمیں گھماتی ہوئی Hanes and Horlington ریلوے سٹیشن کے سامنے لے آئی اور اس کے مطابق یہیں کہیں ہمارے مطلوبہ اپارٹمنٹس تھے۔ کچھ دیر گومگو کی کیفیت سے دوچار رہنے کے بعد آصف نے وہاں پر موجود ایک راہگیر سے اپارٹمنٹس کا راستہ دریافت کیا جنہوں نے قطعی طور پر لاعلمی کا اظہار کیا۔ چنانچہ آصف نے اپارٹمنٹس کے استقبالیہ پر فون ملایا تو انہوں نے پتے میں کچھ ردوبدل کرکے کہا کہ اب یہ پتہ ہمیں اس عمارت کے سامنے لے آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔ یہ سفید اور سلیٹی رنگ کی شیشے کی بنی ہوئی بے حد خوبصورت اور عالیشان عمارت تھی۔

رہائش گاہ کو سامنے پا کر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا کیونکہ سفر کی تھکان اتارنے اور بچوں کو تازہ دم کرنے کے لئے یہ مناسب ترین جگہ تھی۔ آصف گاڑی کھڑی کرنے کیلئے پارکنگ کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے گئے تو پتہ چلا کہ ان اپارٹمنٹس کے نیچے زیر زمین پارکنگ کی سہولت موجود ہے۔ گاڑی کھڑی کر کے ہم سامان اور بچوں کے ہمراہ جب استقبالیہ پر پہنچے تو وہاں موجود خاتون نے آصف سے کچھ کاغذات پر دستخط لئے اور کمرہ نمبر ۱۰۴ کا الیکٹرانک کارڈ تھما دیا۔ یہ نہایت کشادہ اپارٹمنٹ تھا جس میں ایک ماسٹر بیڈ، خوبصورت غسل خانہ، تمام اشیائے ضروریہ سے لیس باورچی خانہ اور مہمان خانہ شامل تھا۔ اسٹور میں استری کی میز اور استری موجود تھی۔ مہمان خانے کی کھڑکی سے قریب میں واقع ریلوے اسٹیشن کی پٹڑی پر چلنے والی ریل گاڑی برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہمارے ہمراہ جتنا سامان تھا سب کو ان کی مناسب جگہوں پر رکھ کر ہم تازہ دم ہوئے اور پھر سے تفریح گاہوں کو گھومنے کی غرض سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ آصف نے لندن کی بلند قامت عمارت (دی شارڈ) کے کھلنے کے اوقات انٹرنیٹ سے دیکھے تو اس کے بند ہونے میں صرف دو گھنٹے کا وقت رہ گیا تھا جبکہ ہماری رہائشگاہ سے اس عمارت کا فاصلہ کم وبیش ایک گھنٹے تک کا تھا جو لندن کی ٹریفک کے باعث دو گھنٹے میں تبدیل ہوسکتا تھا۔ چنانچہ سیر وسیاحت کا ارادہ اگلے روز تک مئوخر کرکے ہم نے رات کے کھانے کا انتظام کرنے کے بارے میں سوچا۔ میں نے قریب ہی قائم ریستوران ''کڑاہی ایکسپریس'' کا پتہ اپنے موبائل میں محفوظ کر رکھا تھا مگر وہ چونکہ صرف پانچ منٹ کی مسافت پر تھا اور دل بے تاب لندن کی سیر کو مچل رہا تھا تو آصف نے وائیٹ چیپل روڈ پر قائم ریستوران ''بندو خان'' کا پتہ نیوی گیشن پر ڈالا جو وہاں سے آدھ گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔

رِم جھم رِم جھم بارش کی بوندیں برسیں تو یوں محسوس ہوا کہ برسوں بعد لندن کی جانب آنے پر وہاں کی سڑکوں پر بادل خوشی کے آنسو برسا

رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''اے سیاحو! کتنا یاد کیا تمہیں۔ پہلے بھی ہمیں اداس چھوڑ کر واپس گھر کو لوٹ گئے تھے......''

دل نہال تھا۔ ہم اور موسم دونوں خوش تھے۔ رفتہ رفتہ سڑکیں ٹریفک کے باعث بے ہنگم رش میں تبدیل ہونے لگیں۔ جوں جوں ہم ریستوران کی جانب بڑھتے سڑک پر موجود رش ہمارا استقبال کرتا۔ بھوک کی شدت سے آتیں قل ھواللہ پڑھنے لگیں۔ سڑک پر موجود رش کسی طور تھمنے کا نام ہی نہ لیتا کہ خدا خدا کر کے ریستوران آ پہنچا۔ اگلا مسئلہ پارکنگ کیلئے جگہ کی تلاش تھا جو کہ رحمتِ خداوندی سے ''بندو خان'' سے پیدل کے راستے پر مل گئی۔ بارش زوروں پر تھی۔ آصف نے فارعہ کو گود میں اٹھایا اور میں نے ہادی کا ہاتھ تھاما اور ریستوران کی جانب دوڑ لگا دی۔ وہاں کے بیروں نے دس سے پندرہ منٹ میں میز کو لذیذ کھانوں سے بھر دیا اور ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور واپسی کے لئے روانہ ہوئے۔

میں اور آصف کرکٹ کا کھیل دیکھنے کے بہت شوقین ہیں اور اگر میچ پاکستان کا ہو تو اس کو مس کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ رات کو گھر پہنچے تو پورا دھیان ''پاکستان اور زمبابوے'' کے مابین کھیلے جانے والے آئی سی سی کرکٹ ورلڈ کپ کے کرکٹ میچ کی جانب تھا۔ خوش قسمتی سے مہمان خانے میں دیوار پر نصب ایل سی ڈی ٹی وی موجود تھا۔ میچ برطانیہ کے وقت کے مطابق رات ساڑھے تین بجے شروع ہونا تھا۔ لہٰذا پاکستان کی کامیابی کی دعائیں مانگ کر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ صبح اٹھے اور ٹی وی چلایا تو چینل گھمانے سے پتہ چلا کہ یہاں کھیلوں کو نشر کرنے والا سکائی سپورٹس تو چینل نہیں آتا بہر حال وائی فائی کی سہولت دستیاب ہونے کے باعث انٹرنیٹ پر پاکستان اور زمبابوے کا اسکور دیکھتے رہے۔

آصف کو کاروباری میٹنگ کیلئے کسی سے ملنا تھا۔ وہ صبح دس بجے وہاں روانہ ہو گئے اور مجھے بچوں سمیت تیار رہنے کی تلقین کی تاکہ جب وہ وہاں سے واپس آئیں تو بلا تاخیر گھومنے کے لئے نکلا جا سکے۔

اتوار کی صبح بھی ٹریفک کی سست روی نے گھنٹے کے فاصلے کو دو اڑھائی گھنٹے کی مسافت میں تبدیل کر دیا۔ اس وقت ہماری منزل لندن کے دل میں واقع دریائے تھیمز کے کنارے بنی ہوئی بلند و بالا عمارت ''دی شارڈ'' تھی۔ ہماری نظر جس بلند قامت عمارت پر پڑتی ہم سمجھتے کہ یہی دنیا کی دوسرے نمبر کی بلند ترین عمارت ہے۔ مگر اچانک اس سے بھی اونچی عمارت نمودار ہو جاتی۔ غرضیکہ اندازے لگاتے لگاتے ہم حقیقی عمارت کے قریب جا پہنچے۔

''یا اللہ! اتنی بلند......''

اللہ نے انسان کو کیسی کیسی صلاحیتوں سے نوازا ہے! اتنی بلند قامت عمارتیں بنا ڈالیں جن کا آخری سرا آسمان کی وسعتوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ گاڑی سے نکل کر اس عمارت کی حد کو دیکھنے کی کوشش کی تو شیشے کی بنی یہ عمارت پیچھے جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دل کانپ سا جاتا اور اوسان خطا ہونے لگتے۔ کبھی خیال آتا کہ اتنی اونچائی پر چڑھ کر کہیں خوف محسوس نہ ہو مگر چونکہ اس عمارت پر چڑھ کر پورے لندن کا نظارہ کرنے کی غرض سے آئے تھے تو اب اندر گئے بغیر یونہی لوٹ جاتے تو تفریح کے شائق دل کو قرار کہاں آنا تھا!

دی شارڈ

اس کو عمومی طور پر شارڈ آف گلاس کہا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس عمارت کو شیشے سے بنایا گیا ہے۔ یہ کم و بیش 90 منزلہ عمارت ہے جو لندن کے علاقے ساؤتھ وارک میں تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی تعمیر مارچ ۲۰۰۹ء میں شروع کی گئی اور اس کا افتتاح ۵ جولائی ۲۰۱۲ء کو ہوا جبکہ نومبر ۲۰۱۲ء میں اس کو سیاحوں کیلئے مکمل کیا گیا اور پہلی بار یکم فروری ۲۰۱۳ء کو سیاحوں کی آمد و رفت کیلئے کھول دیا گیا۔ اس کی بلندی ۱۰۱۴ فٹ ہے۔ یہ یورپین یونین کی سب سے بلند عمارت ہے۔ اس کی تعمیر کا سہرا اطالوی معمار فرینزو پیانو کو جاتا ہے جب نیویارک کے عالمی تجارتی مرکز کو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے دہشت گردی کے واقعے میں تباہ کر دیا گیا تھا تو دنیا بھر کے نقشہ نگار اور انجینئر بلند قامت عمارتوں کے نمونوں کی جانچ پرکھ کرنے لگے۔ اس عمارت کا ڈیزائن اس طریقے سے بنایا گیا ہے کہ کسی بھی خراب حالت میں یہ مستحکم رہ سکے۔ اس میں استعمال کیا گیا کنکریٹ، جامع فلور، وزن اٹھانے کی صلاحیت رکھنے والے دیو قامت ستون اور عمارت کی

منفرد شکل سے اس کی ڈولنے کی برداشت ۱۶ انچ بتائی جاتی ہے۔

گراؤنڈ فلور پر ہوٹل اور ریستوران موجود ہیں۔ پہلی سے دوسری منزل پر دفاتر اور خرید وفروخت کی استقبالیہ قائم ہے۔ تین سے پندرہویں منزل تک دفاتر، سولہویں منزل پر الجزیرہ چینل لندن کے دفاتر اور اسٹوڈیو موجود ہیں۔ سترہویں منزل پر وار ایک بزنس سکول موجود ہے۔ اٹھارویں سے اٹھائیسویں منزلوں پر پھر دفاتر جبکہ اکتیسویں سے سینتیسویں منزل میں تین ریستوران موجود ہیں۔ چونتیسویں سے باونویں منزل میں شنگریلا ہوٹل ہے۔ ترپنویں سے پینسٹھویں منزل میں لوگوں کی رہائشگاہیں ہیں۔ اڑسٹھویں منزل سے اوپر سیاحوں کے لئے نظارہ کرنے کیلئے جگہوں کو مخصوص کیا گیا ہے۔

ہم نے استقبالیہ سے دی شارڈ کی آخری منزل سے نظارہ کرنے کی ٹکٹیں خریدنے اور بذریعہ لفٹ تمام منزلیں عبور کرتے ہوئے بالائی منزل پر جا پہنچے۔ اللہ کی رحمت سے موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی زناٹے دار ہوائیں چل رہی تھیں۔ دائیں بائیں جانب شیشے کی دیواریں تھیں تاہم چھت پر کھلا آسمان تھا۔ دل کو مضبوط کر کے جب شیشے کی بنی دیواروں سے نیچے جھانکا تو سر چکرا گیا۔ وہ اونچی اونچی ۱۵ سے ۲۰ منزلہ عمارتیں جن کو ہم گاڑی میں بیٹھ کر راستے میں دیکھتے آئے تھے، وہ اتنی بلندی سے زیادہ سے زیادہ ۲ منزلہ مکانات محسوس ہو رہی تھیں۔ گاڑیاں آپ کے ہاتھ کی مٹھی کے برابر تھیں جبکہ جا بجا ہر سمت چلنے پھرنے والے انسان، انسانی آنکھ سے دکھائی ہی نہیں دے رہے تھے۔ پورا لندن گویا ایک تصویر میں سمٹ آیا تھا۔ وہ سب تفریحی مقامات جو کبھی کتابوں میں پڑھے تھے یہاں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ بائیں جانب لندن آئی جبکہ دائیں جانب دریائے تھیمز پر بنا ہوا لندن برج تھا۔ کئی عمارتیں پینسل کی شکل کی تھیں تو کچھ مستطیل اور کچھ تو اوپر سے انڈے کی مانند تھیں۔ کئی پارک اور باغات، پارلیمنٹ ہاؤس اور ٹریفلگر سکوائر سب اتنی بلندی سے صاف نظر آ رہے تھے۔

ہم نے وہاں خوب تصویر کشی کی اور حفاظت پر مامور ایک شخص کو کیمرہ پکڑا کر اپنی فیملی کی گروپ فوٹو بھی کھنچوا لی۔ بچوں نے بھی وہاں انجوائے کیا۔ لفٹ میں بیٹھ کر مزید اوپر گئے تو ہر جانب دوربینیں لگائی گئی تھیں جن کے ذریعے ہم کسی ایک خاص مقام کو تفصیل سے دیکھ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ رات کے وقت ان مناظر کی تصویریں بھی دوربینوں میں رکھی گئی تھیں۔ رات کے وقت بلاشک وشبہ اتنی بلندی سے لندن کی عمارتیں اور ان پر جلنے بجھنے والی روشنیاں ایسے محسوس ہوتی تھیں جیسے آسمان پر چمکتے ٹمٹماتے ستارے ہوں۔

لندن آئی

یہ سیاحتی مقام دریائے تھیمز کے جنوبی کنارے پر بنایا گیا ہے۔ یہ ایک دیو قامت پہیہ ہے جسے ملینیم پہیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی بلندی ۴۴۳ فٹ اور چوڑائی ۳۹۴ فٹ ہے۔ اس میں ۳۲ انڈے کی شکل کے کیپسول ہیں جن میں بیک وقت ۱۲۵ افراد سوار ہو سکتے ہیں۔ پہیہ ہر ایک سیکنڈ بعد ۱۰ انچ اوپر جاتا ہے گویا ان ۱۲۵ افراد کو ۳۰ منٹ میں ایک چکر لگوا دیتا ہے اس سیاحتی مقام کا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے افتتاح کیا اور سیاحوں کیلئے اس کو ۹ مارچ ۲۰۰۰ء کو کھول دیا گیا۔

ملینیم برج

یہ ۲۰۰۰ء میں سیاحوں کی آمد ورفت کیلئے کھولا گیا۔ اس پر لوگ پیدل دریائے تھیمز کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سفر کرتے ہیں۔ اس کی لمبائی ۱۰۴۷۲ فٹ ہے۔ ایک دن میں تقریباً نوے ہزار لوگ اس پر سے دریا کو عبور کرتے ہیں جبکہ بیک وقت ۲۰۰۰ لوگ اس پر چڑھ سکتے ہیں۔ یہ پل انتہائی خوبصورت اور جدید فنِ تعمیر کا بے مثل نمونہ ہے اور دریا کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

ٹریفلگر سکوائر

یہ اسکوائر اندرونی لندن میں موجود ہے اور یہاں کئی مجسمے اور فوارے لگائے گئے ہیں۔ چار مجسمے شیروں کے بھی ہیں۔ اس اسکوائر کے بیچ و بیچ لگا حسین فوارہ اس جگہ کو پرستان کا روپ دے دیتا ہے۔ عام طور پر اس جگہ کو سال نو اور کرسمس کی تقاریب کے ساتھ ساتھ سیاسی جلسہ و جلوس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

اتنی بے شمار حسین جگہوں کے نظاروں سے آنکھوں کو خیرہ کرنے

کے بعد ہم نے قریبی ریستوران جا کر کھانا کھانے اور دن بھر کی سیر پر تبصرہ کرنے کا پروگرام بنایا لہٰذا ہم قریب میں واقع ریستوران ''لاہوری کباب ہاؤس'' کی طرف روانہ ہو گئے۔ فصلِ ربی سے تمام سیر کے دوران سورج اپنی کرنیں بکھیرتا رہا۔ جونہی ہماری گاڑی ریستوران کے قریب پہنچی یکا یک کالی گھٹاؤں نے آسمان کو گھیر لیا اور تیز بارش ہونے لگی۔ ایسے حسین موسم میں مزیدار گرما گرم پکوان نے نہ صرف بھوک اتاری بلکہ بے حد لطف دیا۔ جب ہم وہاں سے اپارٹمنٹس کی جانب جانے کیلئے گاڑی میں بیٹھے تو انہی بلند و بالا عمارتوں کے بیچ و بیچ بنی سڑکوں سے گزرنا تھا۔ رات کے وقت ان عمارتوں کی سج دھج سحر میں مبتلا کررہی تھی۔ گویا یہ عمارتیں جگمگاتے ٹمٹماتے ستاروں سے سجے کئی کئی فٹ اونچے ستون تھے اور ہم رات کے اس پہر ان کے درمیان سے اپنے اپارٹمنٹ کی جانب جانے والے راستے کو متلاشی نظروں سے ڈھونڈ رہے تھے۔ گھر پہنچے تو دن بھر کی تفریح سے ہوجانے والی تھکان کو اتارا اور جی بھر کے سوئے اگلے دن اپارٹمنٹ میں رہنے کی معیاد صبح گیارہ بجے تک کی تھی۔ لہٰذا ہم چیک آؤٹ کر کے نکل آئے میں اور بچے آصف کی میٹنگ کے دوران گاڑی میں انتظار کرتے رہے۔

آصف نے جہاں گاڑی پارک کی وہاں سے لندن کا ہوائی اڈا محض چند میل کی دوری پر واقع تھا۔ چنانچہ وہاں اترنے والے جہاز بہت قریب سے نظر آتے تھے۔ جہاز کی آواز سن کر جب ہم نے مڑ کر دیکھا تو یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ جہاز انتہائی نیچی پرواز کرتے ہوئے ہماری دائیں جانب سے گزرا۔ اس کا یہاں سے حجم اتنا نظر آتا تھا کہ جتنی ایک بڑی بس ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ہم بآسانی اس ایئرلائن کا نام بھی پڑھ سکتے تھے جو ابھی ہیتھرو ایئرپورٹ پر لینڈ ہو رہی تھی۔ یہ دنیا کا مصروف ترین ہوائی اڈا ہے جہاں پر ایک منٹ کے وقفے سے ایک جہاز رن وے پر اترتا ہے۔ آصف جب دفتر میں میٹنگ کی غرض سے چلے گئے تو میں نے ان جہازوں کی تھوڑی سی ویڈیو بھی بنائی۔ جہاز کو اتنے قریب سے دیکھ کر بھی جو کیفیت طاری تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ لگتا تھا جیسے میں آسمان کے کسی بادل پر بیٹھی اردگرد اڑنے والے جہازوں کا مشاہدہ کررہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد فارعہ بھی بیدار ہوگئی۔ پہلے پہل تو میں بچوں کو نظمیں سنا سنا کر محظوظ کرتی رہی مگر اس بات سے تو سب واقف ہیں کہ گاڑی چلے تو بچے سو جاتے ہیں اور اگر رک جائے تو کتنے بے چین ہوجاتے ہیں اور ایسا ہی ہوا۔

سورج آج بھی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ جب دھوپ کی کرنیں گاڑی کا درجہ حرارت بڑھانے کا باعث بننے لگیں تو آصف نے آکر گاڑی کا رُخ تبدیل کردیا۔ ان کے واپس اندر جاتے ہی بچے بے حد بے چین ہو گئے۔ میں نے دونوں کے کپڑے ہلکے کئے اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اس سے بھی بات نہ بنی تو فارعہ کو اٹھا کر باہر ٹہلنے لگی۔ دوپہر کے 2 بج رہے تھے اور بھوک زوروں پر تھی۔ آصف لوٹے تو ہماری اگلی منزل یعنی شاپنگ مال آدھ گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔

سینٹ این شاپنگ مال

جب بھی کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو شادی سے قبل میری ماما اور ابولا دیا کرتے اور شادی کے بعد آصف۔ آج شادی کے پانچ سال بعد پہلی بار میں نے خود خریداری کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ سب بھی حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے......خاتون اور شاپنگ نہ کرتی ہو؟ جی ہاں! یہ حقیقت ہے۔ میں نے شادی کے ان پانچ سالوں میں بہت ہی کم بار بچوں کے لئے آصف کے ہمراہ برطانیہ سے کچھ خریدا ہوگا۔ ان کے اور ہمارے کپڑے اکثر و بیشتر بچوں کی دادی جان یا کبھی میری ماما بھجوا دیا کرتی ہیں۔

شاپنگ مال کی پارکنگ کیلئے چھ سات منزلہ عمارت مختص کی گئی تھی۔

نچلی منزل پر کپڑوں، جوتوں، جیولری اور کتابوں وغیرہ غرضیکہ ہر چیز کی دکان موجود تھی۔ میں نے پری مارک سے ہادی اور فارعہ کیلئے چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ جب ہم لفٹ سے نیچے آنے لگے تو اچانک وہ ہوا جس کے بارے میں کوئی موویز میں ہی دیکھتا ہے۔ یعنی لفٹ کھلنے سے پہلے ہی لفٹ کی لائیٹ بند ہوگئی اور ہم اس اندھیر نگری میں بند ہو گئے۔ ہمارے علاوہ لفٹ میں دو اور لوگ بھی موجود تھے۔ آصف اور میں نے لفٹ کے دروازوں کو زور زور سے بجایا کہ شاید باہر

خریداری کرنے والے افراد لفٹ کا دروازہ بجنے کی آواز سن کر ہماری طرف متوجہ ہو جائیں اور ہمیں اس دل دہلا دینے والے قید خانے سے آزاد کرا دیں۔ ابھی بچے بھی حوصلے میں تھے۔ آصف نے موبائل کی ٹارچ چلانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ خدا کے فضل سے لفٹ کی روشنی بحال ہو گئی اور خود بخود اس کا دروازہ کھل گیا اللہ کی اتنی بڑی رحمت نجانے کس نیکی کے بدولت تھی کہ بے اختیار دل اللہ کی رحمت سے جھوم اُٹھا۔

ان چند لمحات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر اللہ کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو اس لفٹ کی جانب اوروں کو متوجہ کرنے میں نجانے کتنی دیر بیت جاتی۔ سارے راستے بیتے پل اور حسین مناظر کے بارے میں باتیں کرتے آئے ۲ راتوں کے بعد گھر کے بستر پر جو نیند آئی اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔

البتہ جن نئی جگہوں اور مناظر سے ہم نے اپنی آنکھوں کو خیرہ کیا، وہ یادیں چاہے جتنی بھی مدھم اور پرانی ہو جائیں، ہماری زندگی کی داستان کا ایک حسین باب بن چکی ہیں۔ لندن کو اتنی بلندی سے دیکھا اور جہازوں کو زمین کے قریب دیکھا۔ رات کو زمین پر عمارتوں کی صورت میں جگمگاتے ستارے دیکھے اور اتنی بلندی پر بادلوں کے سائے میں انسانوں کو کھلے آسمان تلے شیشے کے کمروں میں چلتے دیکھا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

☆ آمنہ راحت! برائے مہربانی اپنا ای میل ایڈریس ارسال کیجئے۔

☆......☆......☆

آسیہ راشد

ایک ہنستی مسکراتی شام

ادبی میلوں کے پرشور ہنگاموں میں حریم ادب لاہور نے بھی ایک ادبی محفل کا ہنگامی بنیادوں پر انعقاد کیا۔ ڈاکٹر بشریٰ تسنیم ان دنوں شارجہ سے لاہور صرف تین روز کیلئے تشریف لائی تھیں۔ پہلے ہی ادبی محفل سجانے کیلئے سوچ بچار اور مشورے ہو رہے تھے کیونکہ کچھ وقت گزر گیا تھا۔ لہٰذا 6 مارچ 2015ء کی خوبصورت شام ڈاکٹر بشریٰ تسنیم کے ساتھ منانے کے لئے اس محفل کا اہتمام ہوا۔ یہ تقریب ڈاکٹر ابوبکر شاہد صاحب کے ہاں منعقد ہوئی جو نگران مدیرہ محترمہ ثریا اسماء صاحبہ کے صاحبزادے ہیں۔ اس نشست کی کامیابی میں ان کی اہلیہ ماریہ ابوبکر کا بھی بہت عمل دخل رہا۔ ان کا گھرانہ ان کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کرتا ہے۔ اتنے پرسکون ماحول میں تقریب کی کامیابی یقینی تھی۔ حریم ادب کی نشستوں میں جو تحریریں پیش کی جاتی ہیں ان میں سماجی و سیاسی شعور، روح عصر، حالات حاضرہ اور مستقبل بینی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ ساتھ ہی خیر کے فروغ اور برائیوں کے سدباب کیلئے راستے تلاشے جاتے ہیں۔ بعد از نشست مقدور ہو تو کھانا کھلا دیا نہیں تو ہلکی پھلکی چائے پر بھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ ہمارے لکھاری دنیا کے انوکھے، بے لوث لکھاری ہیں۔ جی جان سے محنت کرتے ہیں، بہترین تخلیقات سامنے آتی ہیں، مگر مجال ہے جو کبھی کسی نے معاوضہ طلب کیا ہو۔ تمام ادب پارے رب کریم کے نام کر دیئے جاتے ہیں کہ وہی معاوضہ بھی دے گا اور ادب کی نمود کا کام بھی کرے گا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی ہماری حالیہ نشست کی۔ تقریباً چار بجے تک تمام مہمان خواتین تشریف لا چکی تھیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ حریم ادب میں صرف خواتین شرکت کرتی ہیں جس کی وجہ سے بے تکلفی کا ماحول رہتا ہے اور اظہار رائے میں سبھی پرسکون رہتے ہیں۔ تمام شرکاء اپنی اپنی زنبیلیں اپنے ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔ انہوں نے جو چاند ستارے چھپا رکھے تھے انہیں دکھانے کیلئے اپنی باری کے منتظر تھے۔

ام صائم کی تلاوت قرآن کے بعد شاہدہ ناز قاضی نے اپنا تعارف پیش کیا ان کی لیاقت، صلاحیت اور محنت کے سبھی معترف ہیں۔ آپ منجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں، اُردو ڈائجسٹ، بتول اور دیگر جرائد میں آپ کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''رگ جاں سے قریب'' منظر عام پر آ کر مقبولیت کی سند پا چکی ہے۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر بشریٰ تسنیم نے بتایا کہ ان کے والد کی شدید خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر تو نہ بن سکی مگر ہومیو ڈاکٹر بن گئی۔ بچوں کے رسالے ''نور'' سے لکھنے کا آغاز کیا۔ آج کل بتول، پکار، عفت میں لکھ رہی ہیں۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ ''بارش کے بعد'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

قمر پرویز نئی لکھاری ہیں۔ باوقار شخصیت کی مالک ہیں اور انگریزی ادب کی استاد۔ بحیثیت استاد لوگوں کے باطن سنوارنے پر بھی توجہ دیتی ہیں۔

اس محفل میں گل رعنا بھی تھیں جن کی جوہر شناس نگاہیں نگینے ڈھونڈنے میں ماہر ہیں وہ انہیں تلاش کر کے اپنے اپنے مقام پر سجاتی پھرتی ہیں۔ درد دل کے بہت سے کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ ان کی بچوں کیلئے کتاب ''خطرناک سازش'' مقبول ہو چکی ہے۔

شہزادی ام صائم دین کی سربلندی کا شدید جذبہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں وہ ایوان اقبال کی ممبر ہیں اور وہاں بھی حاضری دیتی ہیں۔ بتول کی لکھاری بھی ہیں۔ ادب شناس سامعین میں ام کلثوم اور نادرہ سلمان بھی بہت شوق سے سننے آئی تھیں۔ رمیصا فہیم سعیدہ احسن صاحبہ کی صاحبزادی سوشل سکیورٹی ہسپتال میں سائیکالوجسٹ ہیں۔ انہوں نے اپنی والدہ کی وفات پر جو تحریر لکھی وہ آج بھی آنکھوں کو نم کر دیتی ہے۔ ہم

ان کی نئی تحریر کے منتظر ہیں۔

ڈاکٹر سعدیٰ مقصود فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی ریٹائرڈ استاد ہیں۔آپ مزاحیہ ادب تخلیق کرتی ہیں۔خود سنجیدہ رہ کر اپنی تحریر پڑھتی رہتی ہیں اور سامعین ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے ہیں۔ایسی زندہ دل تحریروں کی آج کے وقت میں اشد ضرورت ہے۔آج کل چھ مدرسوں کو چلا رہی ہیں''ہلکا پھلکا'' کے نام سے کتاب چھپ چکی ہے۔

صبیحہ نبوت صاحبہ جذبات کی لکھاری ہیں بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ان کی بہت سی تحریریں بتول کے صفحات میں جگمگاتی ہیں۔

اس تقریب کی میزبان ثریا اسماء صاحبہ جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے''عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں'' کے مصداق درس و تدریس کے ساتھ ساتھ بتول کی نگرانی بحسن وخوبی انجام دے رہی ہیں۔ایسے لوگ قابل تقلید ہوتے ہیں۔ان کا سوڈان کا سفرنامہ''نیل کے ساحل سے لے کر'' مقبولیت پا چکا ہے۔ان کے تجربات علم آگاہی اور شعور سے بھرپور ہیں۔

حمیرہ، خالہ جان زہرہ وحید کی صاحبزادی ہیں۔آپ بہترین مقررہ اور بہترین استاد ہیں۔انہوں نے اسلامیات کے نصاب کیلئے ایک کتاب مرتب کی ہے جو حکومت پاکستان کو منظوری کیلئے دی گئی ہے۔ادب کا عمدہ ذوق رکھتی ہیں مگر ہم ان کی تحریروں سے محروم ہیں۔دیکھیں بارش کا پہلا قطرہ کب گرتا ہے۔

رافعہ قیوم نے''اس محفل کا سب سے چھوٹا بچہ'' کہہ کر اپنا تعارف کروایا۔آپ زہرہ وحید صاحبہ کی بیٹی پروین کی صاحبزادی ہیں۔انہوں نے یو ای ٹی سے انجینئرنگ کی ہے۔آج کل پڑھا رہی ہیں۔ادب شناس ہیں یہی شوق اس محفل میں انہیں کھینچ لایا۔نصرت محمود قریشی متاثر کن شخصیت کی مالک ہیں۔گرے رنگ کی پلین ساڑھی میں باوقار لگ رہی تھیں۔ان کے خوبصورت کالم اسمائے حسنیٰ اور دیگر نگارشات سے بتول کے صفحات مزین رہتے ہیں۔وہ قرآنی کہانیوں کو انگریزی زبان میں بچوں کیلئے لکھ چکی ہیں اور آج کل ان کہانیوں کی ویڈیو بنانا چاہتی ہیں۔

جس محفل میں ڈاکٹر فرات غضنفر نہ ہوں وہ ادھوری اور پھیکی لگتی ہے۔آپ خوبصورت شاعرہ اور عمدہ بات چیت کے ذریعے محفل گرمانے کا ہنر جانتی ہیں۔بہت سالوں تک فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے ادبی پروگراموں اور مشاعروں کی شاندار کمپیئرنگ کی۔ان کی گفتگو میں لپکتے ہوئے شعلوں کا تاثر ملتا ہے۔حب اللہ اور حب رسولؐ ان کی گفتگو کا مرکز ومحور ہے۔ان کی شاعری کا مجموعہ''شام آنے کو ہے'' منظر عام پر آ چکا ہے۔آج کل درس وتدریس ہی زندگی کا مقصد ہے۔

روبینہ عاطف کی تحریریں لوگوں کو چونکا دیتی ہیں۔نوآموز ہونے کے باوجود جلد ہی نئے لکھاریوں میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔فرحت زہیر فیملی میگزین''نوائے رابطہ'' کی انچارج ہیں، پنجابی شاعرہ ہیں خوب لکھتی ہیں۔زہرہ وحید صاحبہ کے دانش وفہم سے پر لب و لہجے نے سبھی کے دلوں کو موہ لیا۔تقریب کے بعد لوگ مجھ سے فون پر پوچھتے رہے کہ یہ کون بزرگ خاتون تھیں۔جو انہیں پہلی بار ملے وہ بھی مرعوب ہوئے اور جو ہمیشہ سے انہیں جانتے تھے وہ بھی ان کی شخصیت اور کام سے دوبارہ روشناس ہوئے۔آپ تحریکِ اسلامی کی ان بنیادی خواتین میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اللہ کیلئے وقف کر دی۔حمیدہ بیگم، زبیدہ بلوچ، بنت الاسلام اور رخشندہ کوکب کی ہمراہی میں رہیں۔انہوں نے خلق خدا کو آگاہی کی منزلوں سے آشنا کروانے کے ساتھ ساتھ انہیں بنیادی سہولتیں بہم پہنچانے جیسا فریضہ بھی تمام عمر انجام دیا۔آپ نے شہروں کے علاوہ دور دراز کے دیہاتوں میں جا کر علم کے چراغ روشن کئے اور لوگوں کے روزمرہ کے مسائل حل کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کیں۔ان کا کام شمعیں جلانا اور ہمارا ان کے نقش پا پہ چلنا ٹھہرا۔

تعارف کے بعد سبھی نے اپنی اپنی زنبیلیں کھولیں۔شاہدہ ناز قاضی نے اپنی دو نظمیں، بشریٰ تسنیم نے اپنا کالم''محبت کے رنگ''ام صائم کی اقبال پر تحریر،سعدیٰ مقصود کی''رانجھا رانجھا کر دی'' فرات نے اپنی نعت احمد مجتبیٰ، صبیحہ نبوت نے''میرے پارٹنر'' روبینہ عاطف نے''تعلق'' فرحت زبیر کی پنجابی شاعری نے خوب رنگ جمایا۔صائمہ اسماء نے اپنی شاعری کے مجموعے''گل دوپہر'' سے نظم''وہ دن بہت پاس آ گا

ہے‘‘ پیش کی۔صائمہ کی شاعری میں نہ کہیں اتراہٹ ہے اور نہ ہی نمود و نمائش،صرف محبت ہی محبت ہے۔

ہماری ادیب اور شاعرات کی تحریروں اور کلام میں دریاؤں جیسی روانی، جھرنوں جیسی نغمگی اور بہار جیسی دلکشی پائی جاتی ہے مگر نفس کی بندھی نگاہوں نے صالح تخلیقات کو پروان چڑھایا ہے۔سبھی نے بہت محنت سے لکھا اور اچھی طرح پڑھا۔اس نشست کی خاص بات یہ رہی کہ اس میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کے رنگ نمایاں رہے۔

کچھ لوگوں کی کمی بہت محسوس ہوئی۔عفت قریشی صاحبہ جو ہمارا بہترین سرمایہ ہیں (اللہ انہیں صحت اور زندگی دے) کو خرابی صحت اور سمیہ مسعود صاحبہ کو ان کی بیٹی ام شریک کی علالت کے سبب مدعو نہیں کیا گیا۔ نجمہ یاسمین یوسف صاحبہ اچانک رونما ہونے والی ذاتی مصروفیت کی بنا پر شامل نہ ہوسکیں اور فرزانہ چیمہ نے شرکت سے معذرت کر لی۔

سامعین بھی ادبی ذوق رکھنے والے تھے۔کچھ کی تو خالص ادبی گھرانوں سے نسبت تھی۔مومنہ خان جو معروف شاعر ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم (ایڈیٹر ایشیا) کی نواسی یعنی طیبہ یاسمین (مرحومہ) کی بیٹی ہیں اور ثریا اسماء صاحبہ کی بہو ہیں وہ مع اپنی بیٹیوں کے شامل تھیں۔نیز صائمہ اسماء کی نئی نویلی پیاری سی بہو حریمہ کی شرکت نے محفل کو چار چاند لگا دیئے۔سبھی نے پروگرام بغور سنا،سمجھا اور داد دی۔

نماز مغرب کے بعد ثریا اسماء صاحبہ کی دعا کے ساتھ یہ نشست اختتام کو پہنچی۔ ماریہ ابوبکر کے خلوص دل سے بنائے گئے پر لطف لوازمات اور گرما گرم چائے نے تقریب کی رونق کو دوبالا کر دیا۔یوں ڈاکٹر بشریٰ تسنیم کی شارجہ سے لاہور آمد، لاہور والوں کو ایک ہنستی مسکراتی شام کا تحفہ دے گئی اور اس بات کو یقینی بنا گئی کہ شارجہ اب دو وجوہ سے جانا جائے گا۔ ایک تو وہ کرکٹ کی وجہ سے مشہور ہے، دوجے بشریٰ تسنیم کی وجہ سے!

☆......☆......☆

میری لائبریری سے

یہ کتاب جواب اکثر میرے سرہانے ہوتی ہے کہ اسے واپس شیلف میں رکھنے کو دل نہیں چاہتا وہ ہے ڈاکٹر محمد بن عبدالرحمٰن العریفی کی کتاب ''زندگی سے لطف اٹھائیے۔'' اس کتاب کا موضوع انسانی مسائل اوران کا حل ہے۔ یہ حل اسوۂ حسنہ کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں زندگی گزارنے کے سنہرے اصول اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بتائے گئے ہیں۔

چند مضامین کے عنوانات ملاحظہ کریں اپنے آپ کو ترقی دیں، نمایاں بنئے، مہارتوں سے لطف اٹھائیے، نام یاد رکھیں، استاد بننے کی کوششیں نہ کریں، ہم اختلاف کرتے ہیں اس کے باوجود دوست ہیں......وغیرہ وغیرہ

عنوانات اگرچہ طویل نہیں لیکن مضامین میں چھوٹے چھوٹے جملوں کے ساتھ مسئلہ کی گرہ کھولی گئی ہے۔ ہر مضمون کے آخر میں نتیجہ ضرور بتایا گیا ہے جو اس مضمون کے مطالعہ کے بعد آخر میں پڑھ کر آپ کو ضرور ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے زندگی کو بہتر سے بہتر گزارنے کیلئے آپ نے کوئی ایک اہم نکتہ ذہن نشین کرلیا ہے۔ ڈاکٹر محمد العریفی سعودی عرب کے اصل باشندے ہیں ان کا تعلق عرب کے مشہور قبیلے بنو خالد (بنو مخزوم) سے ہے اور یہ بات تو پھر آپ سب سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ وہ بنو خالد کے مشہور سپہ سالار مجاہد اور صحابی حضرت خالد بن ولید کی اولاد ہیں۔

عربی زبان میں ان کی یہ کتاب اگست 2007ء میں شائع ہوئی محض ایک سال میں اس کے دس لاکھ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ اس سے ڈاکٹر صاحب بیس سے زیادہ کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ ایک کتاب جو توحید کے موضوع پر ہے ''ارکب معنا'' جس کے 40 لاکھ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

زیرنظر کتاب ''دارالسلام'' اشاعتی ادارے نے شائع کی ہے اس کتاب کے بارے میں مصنف خود لکھتے ہیں کہ اگرچہ میری چند کتابوں کے بعض ایڈیشن بیس لاکھ نسخوں سے زیادہ ہیں لیکن حقیقت میں مجھے یہ کتاب اپنی تمام کتابوں سے زیادہ پیاری اور نفیس معلوم ہوتی ہے۔ عملی فوائد کے اعتبار سے بھی یہ کتاب جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری ساری کتابوں سے فزوں تر ہے یہ ایک مہینے یا ایک سال کی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ثمرہ ہے میری ان تحقیقات کا جن پر میں نے اپنی زندگی کے بیس قیمتی سال صرف کیے۔ مصنف اس کتاب کی غرض بتاتے ہیں کہ ''غرض یہ نہیں کہ آپ محض ایک کتاب پڑھ ڈالیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں۔''

ڈاکٹر صاحب ایک مضمون ''مسکراؤ......پھر مسکراؤ......مسکراتے جاؤ'' میں سیرت کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ایک دن نبیؐ کسی کام سے جا رہے تھے۔ انسؓ بن مالک بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ نبیؐ نے موٹے کنارے والی نجرانی چادر اوڑھ رکھی تھی راستے میں ایک اعرابی دونوں کے پیچھے چلتا ہوا آیا۔ وہ نبیؐ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو نبیؐ کی چادر کا پلو اُس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے چادر کو ایک جھٹکے سے کھینچا۔ حضرت انسؓ بتاتے ہیں کہ اس بدو نے چادر اس شدت سے کھینچی کہ نبیؐ کی گردن پر رگڑ کے نشان پڑ گئے۔ یہ بدو کیا چاہتا تھا؟ آپ سوچتے ہوں گے کہ وہ کسی نہایت ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوگا۔

شاید اس کا گھر جل رہا تھا اور وہ مدد مانگنے آیا تھا؟ یا اس کے قبیلے کو مشرکین کی طرف سے کسی حملے کا اندیشہ تھا اور وہ ان کے خلاف تعاون حاصل کرنے آیا تھا؟

نہیں ایسا بالکل نہیں تھا۔

اس نے چھوٹتے ہی کہا اے محمدؐ (یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اس نے احتراماً اے اللہ کے رسول نہیں کہا) بلکہ نہایت درشت لہجے میں بولا

''اے محمدؐ تمہارے پاس جو اللہ کا مال ہے اُس میں سے مجھے بھی کچھ دو۔''

رسول اللہ نے مڑ کر دیکھا اور ''مسکرا دیئے۔'' پھر حکم دیا کہ اسے کچھ دیا جائے۔

جی ہاں رسولؐ اللہ ایک بہادر انسان تھے۔ اس نوع کا برتاؤ انہیں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ معمولی باتوں پر نہ آپؐ کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا اور نہ آپ ان کا بدلہ لیتے تھے۔

رسولؐ اللہ حد درجہ نرم دل تھے۔ آپؐ قوی اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ بدترین حالات میں بھی مسکراتے تھے۔ کام کرنے سے قبل اس کے انجام پر غور کرتے۔ اندازہ کیجئے کہ اگر رسولؐ اللہ اس اعرابی پر بگڑ جاتے یا اسے دھتکار دیتے تو نتیجہ کیا نکلتا کیا ایسا رویہ اختیار کرنے سے نبیؐ کی گردن کا زخم ٹھیک ہو جاتا؟ یا بدو تقاضا کرنے کا ڈھنگ سیکھ جاتا؟

دیکھا آپ نے قارئین کہ کیسے ڈاکٹر صاحب مشکل حالات میں مسکرانے اور مسکراتے رہنا رسولؐ اللہ کی سنت کے ذریعے سکھاتے ہیں۔ یہ ایک مضمون کے چند پیراگراف ہیں۔ پانچ سو پچھتر صفحات کی اس کتاب میں ایسے کتنے ہی انمول موتی اور ہیرے ہیں جن کی جگمگاہٹ سے آپ اپنی شخصیت کو خیرہ کن بنا سکتے ہیں۔ اپنی زندگی سے لطف اٹھانے کا ڈھنگ بھی سیکھ سکتے ہیں۔ اس میں پیچیدہ مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں اس میں بہت آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

عربی سے اُردو کے قالب میں ''حافظ قمر حسن'' صاحب نے بہت خوبصورت انداز میں ڈھالا ہے۔ انداز تحریر میں عربی چاشنی اور فصاحت خب محسوس کی جا سکتی ہے۔

اس کے مطالعہ سے آپ ڈیل کارنیگی جیسے دنیا کے پرستار کی کتب سے بے نیاز ہو جائیں گے جو اوروں کو ''راہ نمائی'' فراہم کرتے کرتے خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کی زندگی سچی روحانیت سے خالی تھی۔

عزیز و اقارب اور دوستوں کو مطالعے کی ترغیب دینے کے لیے یہ کتاب ایک بہترین تحفہ ہے۔

☆......☆......☆

امیؒ! فی امان اللہ

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے!

امی آپ پر میرے رب کی رحمتیں ہوں، آپ کی قبر جنت کا باغ ہو۔ امی میں ہر وقت سوچتی ہوں کہ جب جانا ہی ہر انسان کا مقدر ٹھہرا تو پھر ہم جانے والوں کے لیے کیوں روتے ہیں؟ نا سمجھ آنے والا ایک معمہ ہے یہ کیا آپ کے ساتھ میرا تعلق اتنا ہی گہرا ہے کہ آپ میرے ابو کے گھر سے اٹھ کر میرے دل میں آ بسی ہیں۔ امی میرے ابو بالکل اکیلے رہ گئے وہ ہر وقت آپ کی باتیں کرتے ہیں۔ آپ سے بچھڑنے کے بعد ہم نے ابو سے کہا کہ کچھ کھا لیں آپ کی طبیعت نہ خراب ہو جائے تو کہنے لگے میرا شریک سفر بچھڑا ہے مجھے ایک دن تو بھوکا رہ لینے دو۔ وہ کہتے ہیں اللہ میں اس سے راضی تھا تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ وہ تو ساری زندگی میرے جوتے پالش کرتی اور میری ڈانٹ سنتے چلی گئی۔

امی جب کبھی ابو مجھے کہا کرتے تھے کہ تم آج رہ لو تمہاری ماں تمہیں یاد کرتی ہے تو میں شرارت سے آپ کی طرف دیکھ کر کہتی مجھے تو نہیں لگتا کہ امی مجھے یاد کرتی ہیں تو ابو کہتے ہیں تمہاری ماں بڑی پکی ہے تمہارے سامنے اپنے جذبات پر قابو رکھتی ہے تاکہ تم ڈگمگا نہ جاؤ اور اپنے گھر اور سسرال میں تمہارا دل لگا رہے تو اس لمحے آپ کی دبی دبی مسکراہٹ مجھے بہت کچھ بتا دیتی۔

امی آپ تو میرے لیے یادوں کے بے شمار در وا کر گئی ہیں۔ آپ کی مہمان نوازیاں اور اخلاص مجھے یاد ہیں۔ ابو کے بہن بھائیوں سے آپ کے مثالی تعلقات بھی یاد ہیں۔ گاؤں کی میری سادہ لوح پھوپھیاں آپ کو کتنی عزت دیتی تھیں۔ عید پر جب ہم گاؤں جاتے تھے تو آپ کو آگے آگے رکھتیں اور شادیوں میں بھی ہر بچی کی رخصتی میں آپ کا اس کے ساتھ جانا ضروری تھا۔ جب لوگ کسی کی عزت کریں تو پھر اس عزت و مقام کو قائم رکھنے کے لیے بہت کچھ ایثار بھی کرنا پڑتا ہے۔ اپنے ضروری کام اور آرام چھوڑ کر دوسروں کے کام بھی آنا پڑتا ہے۔ امی آپ کو یہ فن بھی خوب آتا تھا۔ اسی لیے آج جو دو پھوپھیاں رہ گئی ہیں (باقی اللہ کے پاس ہیں) وہ آپ کے لیے کتنے اچھے جذبات رکھتی ہیں جو انشاءاللہ آپ کے حق میں گواہی بنیں گے۔

امی میری دادی جان کی بیماری کے آخری دنوں میں جو پانچ چھ دن آپ نے ان کے ساتھ ہسپتال میں گزارے مجھے وہ بھی یاد ہیں۔ وہ آپ کو جس طرح دعائیں دیتی تھیں وہ بھی یاد ہے اور بڑی بھابھی کی زچگیوں میں ان کو (بحیثیت ایک مریض) اور ان کے بچوں کو سنبھالنا اور مبارک کے لیے آئے گئے کی مہمان نوازی بھی یاد ہے۔ اللہ اس خدمت خلق کو میزان کے پلڑے میں بہت وزن دے۔ آمین۔

امی جب ابو نے تایا جی کے بیٹے کو پڑھنے اور بڑی پھوپھو کے بیٹے کو نوکری کی وجہ سے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ تو ان سب کو صبح وقت پر ناشتہ اور کھانا اور دھلے ہوئے کپڑے ملتے تھے۔ گاؤں میں جو بھی بیمار ہوتا تو وہ سیدھا ابو کے پاس آتے پھر ابو ان کو ہسپتال لے کر جاتے۔ اگر کسی کو داخل کرنا پڑتا تو پھر اس کے لیے آپ گھر سے کھانے پکا کر کپڑے دھلوا کر بھیجتیں اور خود بھی اس کو دیکھنے ہسپتال ضرور جاتیں۔ امی آپ کے دل میں کیا تھا میں نہیں جانتی مگر میں نے کبھی آپ کی زبان سے کوئی شکوہ نہیں سنا۔ مجھے ابھی تک کوئی بات یاد نہیں آتی کہ مجھے احساس ہو کہ آپ ان سارے کاموں سے تنگ تھیں۔ آپ کا ایمان تھا کہ احسان کر کے جتانا اجر کو ختم کر دیتا ہے۔ اللہ آپ کو محسنین میں شامل کرے۔

امی جب میں کالج میں پڑھتی تھی تو گرمیوں کے روزوں میں آپ کو گرم دوپہر میں دو ڈھائی گھنٹے قرآن شریف پڑھتے دیکھتی تھی۔ میں کہتی آپ کو نیند نہیں آتی تو آپ ہنس کر کہتی ہیں میں نے ایک گھنٹہ سو لیا تھا۔

میں نے آخر عمر کی تکلیف میں بھی آپ کو زیادہ تر کھڑے ہو کر اور زمین پر سجدہ کر کے نماز پڑھتے دیکھا۔ آپ نے اپنے سونے اور جاگنے اور عبادت کا اپنا ہی شیڈول بنایا ہوا تھا۔ امی، آپ کی جوانی کی عبادتوں کی میں گواہی دیتی ہوں اور میری اپنے رب سے دعا ہے کہ قرآن کی اس محبت کو آپ کی قبر کا نور بنا دے۔

حج کے لیے آپ کی بے قراریوں کو بھی میں جانتی ہوں جب ہم ابو کے ساتھ افریقہ گئے تھے تو وہاں سارے پاکستانی کہتے تھے کہ یہاں سے واپسی پر سب لوگ عمرہ کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ لیکن افسوس جب ہماری واپسی تھی تو جدہ میں ہیضہ پھیل جانے کی وجہ سے عمرہ پر پابندی لگی ہوئی تھی تو ہمیں ایتھنز کا 36 گھنٹے کا Stay ملا۔ امی آپ کتنا روتی تھیں کہ اے اللہ میں تیرے گھر جانا چاہتی تھی مگر مجھے دیکھنے کو ملا کافروں کا ملک۔ ایتھنز میں گھومتے پھرتے میں آپ کی دلی کیفیت کو سمجھ سکتی تھی مگر آپ اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر ہمارے ساتھ پوری دلچسپی کے ساتھ شامل رہیں اور پھر ہر سال صبح کا انتظار کرتے پورے دس سال بعد آپ کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ اس وقت آپ کی خوشی قابل دید تھی ابو دوسری دفعہ جا رہے تھے اور آپ ان سے ہر جگہ کے بارے میں بڑی دلچسپی سے پوچھتیں۔ سارے مناسک کی ادائیگی کا طریقہ گھر ہی سیکھ لیا۔ اللہ کرے پورے خلوص کے ساتھ کیا ہوا حج آپ کی آخرت کی منزلوں کا ساتھی بنے۔

شرک اور بدعت کے بارے میں آپ کا ایمان کتنا پختہ تھا۔ کالونی میں لوگ میلاد کرواتے اور بہ اصرار آپ کو بلاتے تو آپ ان پروگراموں میں ہلکے پھلکے انداز میں بدعت کی نشان دہی ضرور کرتیں۔ ایک دفعہ جب پڑوس میں ایک میلاد میں آنٹی نے نعت پڑھنے والی لڑکیوں کو ڈانٹا کہ نبی پاکؐ کے نام پر انگوٹھا چوم کر آنکھوں کو کیوں نہیں لگاتی اور بھی اسی طرح کی ایک دو تنقیدی باتیں کیں جن سے بچیاں ڈر گئیں تو امی آپ نے آنٹی سے کہا تھا کہ آپ بچیوں کو ہراساں نہ کریں۔ یہ عمل بدعت ہے اچھا ہے وہ نہیں کر رہیں، تو آنٹی غصے میں وہاں سے نکل گئیں۔ شام کو وہ بچیاں ہنستی ہوئی ہمارے گھر آئیں اور کہنے لگیں آج تو خالہ جی کو نوبل انعام ملنا چاہیے۔ آج تو کالونی کی ترش رو آنٹی کو چاروں شانے چت کر دیا۔ لیکن پھر اس کے بعد آپ اپنے دل میں کوئی بغض رکھ کر نہیں بیٹھ رہیں بلکہ آپ نے آنٹی کے ساتھ دوستی بھی کہ جو کہ اتنی گہری ہو گئی کہ کئی سال بعد ان کی وفات سے ختم ہوئی۔ اور آپ ان کے لیے دعائے خیر کرتی رہیں۔
امی یہ حق گوئی آپ کے لیے توشۂ آخرت بنے۔ آمین۔

☆......☆......☆

بنتِ حوا

بیٹیاں ہم ہیں حوا کی عفت بھری
سر سے عزت کی چادر نہ کھینچو میری
تم تو شوہر بھی، بھائی بھی، بیٹے بھی ہو
تم تو بہنوں کے اپنے محافظ بھی ہو

بسنے والے زمیں پہ جو زردار ہیں
یہ تو حرص و ہوس کے پرستار ہیں
یہ تو نسوانیت کے طلب گار ہیں
یہ تو جسم و حیا کے خریدار ہیں

وہ تو لائے ہیں محفل میں شیطان کی
مجھکو رونق بنایا ہے میدان کی
کہہ رہی ہے یہ حوا کی بیٹی کھڑی
سر سے عزت کی چادر نہ کھینچو میری

مجھکو مالِ تجارت بنایا ہے کیوں
مجھ سے کاجل حیا کا چھڑایا ہے کیوں
بے حیائی کا رستہ دکھایا ہے کیوں
میرے آنچل کو پرچم بنایا ہے کیوں

شام رسوائی جسکی ہر اک شام ہے
زروزن کے پجاری کا یہ کام ہے
ذاتِ نسواں سر راہ نیلام ہے
ہے نہ کوئی بھی قیمت یہ بے دام ہے
کہہ رہی ہے یہ حوا کی بیٹی کھڑی
سر سے چادر نہ عزت کی کھینچو مری

تم تو شوہر بھی، بھائی بھی، بیٹے بھی ہو
تم تو عزت کی میرے محافظ بنو
میری عزت کے سوداگروں سے کہو
میری چادر سے سر کو میرے ڈھانپ دو
بیٹیاں ہم ہیں حوا کی عفت بھری
سر سے عزت کی چادر نہ کھینچو مری

☆......☆......☆

ذکیہ فرحت

پاکستان کی بنیاد

فرزانہ خالد

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ پاکستان منظور کی گئی یہ قرارداد دراصل اللہ اور اس کی مخلوق کے ساتھ ایک عہد تھا کہ ہم لا الٰہ الا اللہ کے نام پر ایک خطہ زمین آزاد کرائیں گے۔ چہار سو پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کے نعرے پورے ہندوستان کی گونج بن گئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ ہر قسم کی قربانی دی اور ہجرت کر کے لاکھوں شہیدوں کے خون سے پاکستان کی بنیاد رکھی گھر بار چھوڑے۔ لٹے پٹے پاکستان پہنچے اب اس سرزمین پر کلمہ کی حکمرانی قائم کرنے کا وقت تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اس کلمے کو حرزِ جان بنائے رکھتے مگر قدرت کو ہمارا امتحان مقصود تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح بہت جلد ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔ جاتے جاتے بتا گئے کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں سو ان کھوٹے سکوں نے شروع دن سے ہی کلمے کی حکمرانی سے غفلت برتی کلمہ زبان کی نوکوں پر رہ گیا سسٹم میں نہ اتارا گیا۔ اس پاک سرزمین کا حاکم اعلیٰ اللہ رب العالمین تھا مگر اس وقت کے لیڈران خود حاکم اعلیٰ بن بیٹھے۔ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلانے کے بعد اپنی غلامی میں لے لیا اور خود دلوں میں انگریز کی غلامی کا اثر لیے ہوئے آئے تھے، نتیجتاً اسی کے نظام کو قابل عمل سمجھا۔ یوں کلمہ کی حکمرانی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا چوبیس سال بعد ہمارا ایک بازو جو مشرقی پاکستان کے نام سے جانا جاتا تھا ہم سے جدا کر دیا گیا اور وہ بنگلہ دیش بن گیا۔ ایک بازو کھو دینے کے بعد کیا ہم سنبھل گئے نہیں ہرگز نہیں۔ اب تو ہم انگریز کی بساط کے مہرے بن چکے تھے۔ خالق کے آگے بھی رسوا ہوئے اور اس کی مخلوق جو لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ لگاتی ہوئی ہندوستان سے آئی تھی اس کے آگے بھی رسوا تھے۔ ان کی آنکھیں پاکستان میں اسلامی نظام کا خواب سجائے پتھرا گئی تھیں ہر نئی قیادت سے دورِ فاروقی کی امید باندھتے اور پھر خواب چکنا چور ہو جاتے یہاں تک کہ عمر فاروق کا دور تو کیا دیکھتے عصبیت کو ہوا دی جانے لگی۔ قوم فرقوں میں بٹ گئی۔ کوئی سندھی ہے تو کوئی پنجابی، کوئی پٹھان ہے تو کوئی اردو بولنے والا مہاجر۔

یہود و نصاریٰ کی خوشنودی کے لیے بھائی بھائی کو قتل کرنے لگا۔ قتل ہونے والوں کا نوحہ تو ہے مگر قاتلوں کو پکڑنے والے ہاتھ نہیں ہیں۔ ایٹمی طاقت ہوتے ہوئے بھی یہود کی غلامی قبول کر چکے ہیں۔ امن و سکون تو چھن چکا، اب ایمان کی خیر منائیے اس پر بھی طاغوت کا ایجنڈا کام کر رہا ہے۔ لباس بدلا، زبان بدلی، اقدار بدلیں۔ تعلیم غیروں سے مول لی۔ تہوار بھی اُن کے اپنا لیے۔ ذہن بدلے فکر بدلی، بھول گئے کہ مسلمان کی اپنی جدا تہذیب ہے الگ پہچان ہے۔

حاکم اعلیٰ اللہ رب العالمین کے نظام کو پاکستان میں نافذ کرتے تو آج ہمارا یہ حال نہ ہوتا۔ ہمارے پیارے وطن کی سرزمین فساد سے پٹ چکی ہے۔ ذمہ داریاں دیانت داروں کو سونپنے کی ضرورت ہے۔ امن و قسط کا نظام قائم ہو جائے گا تو فساد مٹ جائے گا۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

☆......☆......☆

پاکستان ایک نعمت

رقیہ احسان

کینو خریدنے لگی تو قیمت سن کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ دبئی کا منظر تھا اور وہ بھی درجن کے حساب سے نہیں بلکہ کلو کے حساب سے چند

دانے، میں نے پاکستان آتے ہی ریڑھی سے ڈھیروں کینو خریدے اور جی بھر کر سستے کینو کھائے۔ میرا ملک میرا پاکستان بات جس کے کینوؤں کی ہی نہیں ہے۔ آپ کو موسم کا ہر پھل انتہائی تازہ اور مناسب قیمت میں ریڑھی پر یا ہر چھوٹی موٹی دکان پر آسانی سے مل سکتا ہے۔ تازہ سبزی، گوشت، مرغی یہ تو سب کھانے کی چیزیں ہیں جن سے ہماری چھوٹی بڑی مارکیٹیں ماشاء اللہ بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ اپنے ملک کے طول وعرض پر نظر دوڑائیں، اللہ کی نعمتیں آپ کو وافر مقدار میں نظر آئیں گی، پنجاب اور سندھ کی ہموار زرعی زمینیں سونا اگلتی ہوئی، کپاس، گنا، گندم، چاول یہ سب خصوصاً کپاس اور چاول تو دنیا کے کسی ملک میں یہ اعلیٰ کوالٹی شاید ہی دستیاب ہو۔

خیبر پختون خوا کے ہرے بھرے اور خوبصورے نظارے اور نایاب قسم کے پھل خصوصاً خشک پھل، جگہ جگہ میٹھے پانی کے چشمے اور جھرنے دیکھنے والوں کو جنت کے نظاروں کا تصور ہونے لگے۔ میرے پاکستان کا صوبہ بلوچستان خزانوں سے مالا مال، بلکہ کہنے والے یعنی ماہرین تو یوں بھی کہتے ہیں، بلوچستان کے پوشیدہ خزانوں پر اگر ہمارے بدنصیب اور غلام حکمران قادر ہو جائیں تو پورے ملک کے قرضے ادا ہو جائیں۔ آج دشمن کی ناپاک اور للچائی ہوئی نظریں ہمارے گرم پانی کے سمندر پر اور رک ڈک کے خزانوں پر لگی ہوئی ہیں، اللہ انھیں کبھی اس کی توفیق نہ بخشے اور ہمارے پاکستان کی حفاظت فرمائے۔ آمین

غالباً سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے بلوچستان کی ساحلی پٹی پر زبردست زلزلہ آیا تھا۔ مچھیروں کی کافی بستیاں تباہ ہوئیں کچھ جانی نقصان بھی ہوا۔ ماہرین کے مطابق یہ زلزلہ سمندر کے اندر آیا تھا جس کے نتیجے میں ایک عجیب غریب نظارہ سمندر کے اندر سے ابھرنے والے جزیرے کا تھا، اس نئے جزیرے کی اطلاع سنتے ہی لوگ جوق در جوق پہنچنا شروع ہو گئے، لوگوں نے دیکھا کہ اس جزیرے سے سوئی گیس کا اخراج اتنی پاور سے ہو رہا تھا جو کہ باقاعدہ دیکھا اور سنا گیا۔ گیس کا اخراج اور بلبلے نکلتے ہوئے محسوس ہوئے، یہ بات علم میں آتے ہی پورا جزیرہ فوج نے اپنے قبضے میں لے لیا، تاکہ کوئی ماچس کی تیلی یا جلتا ہوا سگریٹ نہ پھینک دے۔ ماہرین کا کہنا تھا اس جزیرے پر اللہ نے گیس کی نعمت آپ کے ہاتھ میں رکھ دی تھی، بغیر کسی محنت کے، بہت سے لوگ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ حکومت کو بس پائپ جوڑنے کی ضرورت ہے۔ ملک اس نعمت سے مالا مال ہو جائے گا۔ اللہ نے اپنی وافر نعمت کی نشاندہی کر کے دوبارہ اس جزیرے کو سمندر برد کر دیا۔

میرے ملک کی سب سے بڑی نعمت میرے ہم وطنوں کا صبر بھی ہے۔ اس گھر کے محافظوں نے اس گھر کے بیرونی دروازوں کی حفاظت کا خیال ویسے نہیں رکھا جیسے رکھنا چاہیے تھا، لہٰذا بہت سے دشمن اسلحے سمیت اس کے اندر داخل ہو گئے، جو مسلسل اسلحہ دکھا دکھا کر لوٹ مار میں مصروف ہیں۔ کسی بے گناہ کو لوٹ لیتے ہیں کسی کو قتل کر کے نکل جاتے ہیں۔ کبھی کسی مسجد میں چنگاری ڈال دیتے ہیں اور کبھی کسی دوسری مسجد میں تاکہ اس طرح افراتفری پھیلے، سکون غارت ہو تفرقہ بازی کو فروغ ملے لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹیں۔ میرے پیارے ملک کے حکمران خواب غفلت میں پڑے رہتے ہیں، لگتا ہے نہ وہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی دلجوئی کرنا ان کے بس میں ہے۔ مگر یہ خداداد پاکستان اگر بہت بڑی نعمت ہے تو ماننا پڑے گا اس ملک کے صابر و شاکر لوگ جن کے آنسو پونچھنے والا بھی کوئی نہیں پھر بھی اس دیس کی اکثریت محبِّ وطن ہے۔ دشمن کی تقریباً ساری کوششیں ہی آپس میں لڑانے والی تفرقہ ڈالنے تقریباً ناکام ہو چکی ہیں۔ اللہ اس پیارے گھر کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

وقت کی پابندی کیوں اہم ہے؟

نظام کائنات میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ وقت کی پابندی ہے۔لمحہ بھرکوسوچیں کہ زمین وآسمان کے سارے مدارج ہیں، سیکنڈ کے بھی کسی ادنیٰ سے حصے میں پابندیٔ وقت کی زنجیر کا کوئی حصہ ڈھیلا ہوجائے تو کیا تباہی وبربادی کا سامنا کرنا پڑے گا اوراسی کو قیامت کہتے ہیں۔حشر کہتے ہیں، سارا نظام ایک باندھی ہوئی ترتیب سے منسلک ہے۔ترتیب وقت کی بھی ہے اوراشیاء کی قطار کی بھی۔ازالوں سے یہ باندھا ہوا نظام اپنی مکمل اطاعت کے ساتھ جاری وساری ہے۔انسان اس حسین وجمیل مربوط نظام کی ''بارات'' کا ''دولہا'' ہے۔تو کیا اس شخصیت کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ ''بارات''تو ''مہذب'' ہےاورخود''غیر مہذب''...... ذرا تصور کریں بے سروپا شخصیت کا دولہا۔ بندروں کی طرح اچھل کود کرتا، ناشائستہ لباس پہنے، غیر شریفانہ حرکات کرتا، ایک ایسی بارات کے ساتھ موجود ہو، جس میں کوئی ایک فرد بھی اپنے اعلیٰ مرتبہ سے گری ہوئی حرکت کا سوچ بھی نہ سکتا ہو۔

کسی بھی قوم کے مہذب ہونے کی پہلی نشانی وقت کی پابندی ہے۔ساری کائنات نظامِ قدرت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ کا نظام جس طرح چل رہا ہےاسی نظام کے ساتھ ہی انسان کی زندگی کو جوڑ دیا گیا ہے۔ جب اللہ کے نظام میں انسان اپنے اوقات کارترتیب دیتا ہےتو وہ فطری وقدرتی نظام کا حصہ ہوجاتا ہےاور کائنات اس کے لیے ہمنوا ہوجاتی ہے۔وہ اسی رُخ پر چلتا ہےجس طرف اللہ تعالیٰ کے نظام کا دریا بہہ رہا ہوتا ہے۔اسی روانی میں انسان کے کام آسانی سے اپنی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔اضافی مشقت اورتگ ودو سے بچت ہوجاتی ہے۔ وہ کام مادی ہوں یا روحانی اسی اصول کے ساتھ کامیابی وابستہ ہے۔

انسانی جسم ایک ایسی مشین ہے جو وقت کی پابندی کے ساتھ بھوک، پیاس کا اشارہ دیتی ہے۔سونے جاگنے کے اوقات بھی انسانی جسم میں فٹ کر دیئے گئے ہیں۔بچپن، جوانی، بڑھاپا، موت سب کا وقت اور مدارج معین ہیں۔ایک ایک سیکنڈ اور لمحے کے حساب سے زندگی کے سارے مراحل طے کر دیئے گئے ہیں۔ بچے کی پیدائش سے لے کر موت تک کا حساب اللہ کے پاس وقت کا ہی رکھا گیا ہے۔موسموں کا بدلنا،فصلوں اور پھلوں کا پکنا وقت کی قید میں مقید ہے۔فاصلے طے کرنے کا وقت معین ہے۔ بیماری کے علاج کا وقت اور دوا کا دورانیہ ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو عبادتیں فرض کی ہیں وہ سب کی سب وقت اور مدت کے ساتھ فرض کی گئی ہیں۔نماز، روزہ، حج کے خاص اوقات اور مہینے میں روزانہ پانچ بار نماز کو متعین وقت پہ ادا کرنے کی تلقین بلکہ حکم کوئی معمولی اور سادہ بات نہیں ہے۔ یہ نمازیوں کی پوری زندگی کی تنظیم وتربیت ہے۔اہل ایمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ نظام قدرت کے ساتھ اپنے اوقات کو منسلک کریں۔سورج کے ازلی وابدلی آفاقی پیغام کو سمجھیں۔اس کے طلوع ہونے سے غروب ہونے تک کے مراحل میں کیا کیا نشانیاں ہیں اور یہ روشن چراغ کن معمولات کی ادائیگی میں معاونت کی دعوت دے رہا ہے،کوئی ہے جو اس کی پرخلوص پیش کش کی قدر کرے؟

اس کے علاوہ وہ فرائض جو دن کی روشنی میں ہیں وہ رات کے اندھیرے میں قبول نہیں کئے جائیں گےاور جو رات کے فرائض ہیں وہ دن کو کرنے میں نہ قدرت کی طرف سے معاونت ہوگی نہ برکت۔جیسے جوانی کے کام بڑھاپے میں نہیں ہو سکتے اور بڑھاپے والے حالات جوانی میں سمجھ ہی نہیں آسکتے۔ایک اورتوجہ طلب بات یہ ہے کہ اکثر مسلمان جو صوم وصلوٰۃ کے تو پابند ہوتے ہیں، دیگر دنیاوی معاملات میں وقت کی پابندی کا احساس نہیں کرتے۔ ملاقات کے لئے جانا ہو اور کسی کو وقت دیا ہو تو پابندی کا خیال نہیں۔امانت واپس کرنا ہو، کوئی وعدہ کیا ہو کوئی احساس نہیں۔ایک منٹ کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ ایک گھنٹے کی۔سارا نظام قدرت اورقرآن وسنت کی تعلیم ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ عام زندگی میں وقت کی پابندی نہ کرنا بھی اتنا ہی غیر اسلامی ہے جتنا کہ نماز کے معاملے میں وقت کی پابندی نہ کرنا۔دراصل نماز اور دیگر عبادات وقت کی پابندی سکھانے کے لیے بھی فرض کی گئی ہیں۔ ☆☆

محشرِ خیال

صبیحہ نبوت۔ لاہور

(۲)

مارچ کے بتول میں نصرت یوسف کا افسانہ ''سلسلے وفا کے'' پاکستان کیلئے ہجرت کی داستان ہے کہ کس طرح لٹے پٹے لاکھوں لوگ پاکستان آئے ان کی کہانی کے ہیرو کی پاکستان ہجرت کا تذکرہ ہے، جو بڑا دل خراش ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ سے لو لگی ہو تو کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کی داستان ہے جو دلنشین بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ یوں کہیے انہیں اپنے او پر اعتماد ہے اور کہانی پر عبور۔ ایسا لگتا ہے نصرت یوسف اپنی سوچ اور اس کی ادائیگی میں یکتا ہیں۔ قانتہ رابعہ بھی بتول کی جان ہیں۔ ان کی سوچ، جملوں کی ادائیگی، اندازِ بیان، ماحول کی تصویر کشی، درست زاویہ نظر او پر سے خیالات اور جذبات کا اتار چڑھاؤ لگتا ہے اپنی ہی کہانی ہے، اپنے ہی گھر کی داستان ہے۔ حقیقت سے بھر پور ہے، دلفریب ہے اور مزے دار بھی۔ افشاں نوید نے ''وقت فرصت ہے کہاں'' میں خاندانی تعلقات کو موضوع بنایا ہے۔ پرانی داستان سسرال کے جھگڑے قصے، ماحول کا فرق، مزاجوں میں تضاد، لیکن بزرگوں کی سمجھداری اور عقلمندی اس نظام کو جوڑے رکھتی ہے۔ ''فاصلے'' نبیلہ شہزادی کی اچھی پیشکش ہے۔ لیکن یہاں واپسی کا سفر نظر آتا ہے۔ دنیا آگے بڑھ رہی ہے لیکن ان کی تحریر کے کردار پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔ پرانی یادوں کو ساتھ لے کر چلنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں لیکن یہ بھی سمجھ سے باہر ہے کہ ہر فرد پیچھے کی طرف دیکھے۔ میرا خیال ہے محبت بڑے گھروں میں بھی قائم رہ سکتی ہے۔ ادب، لحاظ، محنت، سلیقہ، خلوص، عقیدت اور خدمت تو تربیت کا اہم حصہ ہے۔ اس کا بڑے اور چھوٹے گھر سے تعلق نہیں ہے۔ عالیہ شمیم کی کہانی ''بڑائی'' اچھی پیشکش ہے۔ انداز بیان سبق آموز ہے۔ گھر میں ایک انسان صلح کن ہو تو رشتے برقرار رہ جاتے ہیں۔ ملاقات کے بعد والدین کا رویہ اور ردعمل کیا تھا مختصر الفاظ میں اس بات کا تذکرہ ہوتا تو اور مزہ آتا۔

شمیم فاطمہ کا انشائیہ سبق آموز ہے۔ غم کو اتنے پیار سے بیان کیا ہے کہ غم خوشی میں بدل گیا ہے، غم نہیں لگتا۔ بیان کا انداز نیا ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود اتنا جامع ہے کہ ایک ایک منظر بہت واضح ہے۔ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

''خیر کے ننھے سفیر'' بھی اچھی سوچ ہے۔ کاش ہر شخص اور ہر حکومت اتنی زبردست ہو جائے کہ اپنے بل بوتے پر قائم رہے دوسروں سے مدد نہ لے۔ جبھی یہ سب ممکن ہے۔ لیکن ہماری تو سب سے بڑی کمزوری غیروں کا دستِ نگر رہنا ہے۔

تحریم اعجاز۔ لاہور

بتول اب تو اکثر مہینے کے پہلے ہفتہ ہی مل جاتا ہے جس سے بہت خوشی ہوتی ہے۔

اپریل کا بتول میرے سامنے ہے۔ سب مضمون اور کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ آپ اور آپ کی ٹیم بہت مبارکباد کی مستحق ہیں جنہوں نے ایسا روشنی کا چراغ جلایا ہوا ہے۔ حضرت خدیجہؓ کے بارے میں مضمون اور شاہدہ ناز قاضی صاحبہ کی کہانی ''کیسا سچ'' اچھی لگی۔ طوبیٰ احسن کی کہانی ''آگ'' بہت سبق آموز اور آنکھیں کھول دینے والی تھی۔

عظمیٰ ابونصر کا افسانہ ''پہچان'' بھی بہت پسند آیا۔ حسن معاشرت میں ''شادی کو رسوم و رواج سے پاک بنائیے'' بہت اہم ہے۔ ہمیں اس پر مجموعی طور پر معاشرے میں عمل کرنے کی کوشش کرنا ہوگی اور اسکو آسان بنانا ہوگا۔ مجموعی طور پر سب مضامین اور کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے کہ اتنے کم خرچ میں (بلکہ فری میں) اتنا اچھا ادب مہیا کرتی ہیں۔

☆......☆......☆

اوریا مقبول جان

سودی معیشت کا کارپوریٹ کلچر اور اس کا لٹریری فیسٹیول

اگر بڑی بڑی نئے ماڈل کی چمکدار گاڑیوں سے اترتے ہوئے ڈیزائنر ملبوسات زیب تن کئے لوگ الحمرا لاہور کی روشوں پر چلتے ہوئے ہاتھوں میں انگریزی زبان میں چھپا ایک ادبی تقریب کا بروشر تھامے ایک ایسی زبان بولتے نظر آئیں جسے آپ نہ انگریزی کہہ سکیں اور نہ ہی اُردو، پنجابی تو خیر ان کو چھو کر بھی نہیں گزری ہوتی کہ اس کے بولنے سے ایک میلے پن کا تصور انہیں گھیر لیتا ہے تو یوں سمجھیں آپ لاہور لٹریری فیسٹیول کے دنوں میں اس جگہ کو دیکھ رہے ہیں۔

کارپوریٹ سرمائے کی چکا چوند سے یہ میلہ اب ہر سال لگتا ہے جس کا ماحول پیرس کی کسی کیٹ واک سے مختلف نہیں ہوتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں کارپوریٹ کلچر کی اشرافیہ کے ملبوسات کی نمائش چند مشہور چہروں کے ذریعے کروائی جاتی ہے اور یہاں اسی کارپوریٹ کلچر کی اشرافیہ کے لئے تخلیق کئے گئے ادب کو چند مشہور چہروں کے ذریعے کروائی جاتی ہے اور یہاں اسی کارپوریٹ کلچر کی اشرافیہ کے لئے تخلیق کئے گئے ادب کو چند مشہور چہروں کی موجودگی اور ملبوسات کی رنگا رنگی سے مقبول بنانے کی بھونڈی سی پیش کش کی جاتی ہے۔ نہ فیشن شو میں کیٹ واک کرتی خوبصورت ماڈلز نے جو ملبوسات زیب تن کئے ہوتے ہیں وہ عام آدمی کے ذوق کی چیز ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کو استعمال کرنے کی وہ استطاعت رکھتا ہے۔

اسی طرح جو ادب ایسے لٹریری فیسٹیول میں پیش کیا جاتا ہے یا جس پر بحث کی جاتی ہے، اس کا بھی عام آدمی سے دور کا واسطہ نہیں۔ اس کا تعلق تو گزشتہ تیس سالوں میں پاکستان میں او لیول اور اے لیول سے جنم لینے والی ایک محدود تعداد سے ہے۔ ایک ایسی نسل جس کا اس زمین سے رشتہ صرف لاؤنج یا ڈرائنگ روم میں چھاپے لٹکانے، اجرک کو فریم کروانے، یا گاؤں میں بسنے والی کسی خاتون کی کڑھائی کو جدید فیشن کے ملبوسات پر لگا کر اسے ایک علاقائی تعلق سے نوازنے تک محدود ہے۔ جو اپنے گزشتہ ماضی کی کہانیاں ایسے پڑھتے ہیں جیسے امریکہ پر قابض نو آبادیاتی گورے ریڈ انڈین کے قصے پڑھا کرتے تھے۔ نو آبادیاتی گورے خود کو غیر متعصب ثابت کرنے کے لئے ان کے بارے میں نظمیں، افسانے اور ناول بھی تحریر کرتے تھے، ہالی ووڈ ان پر فلمیں بناتا تھا لیکن یہ سب کا سب صرف اور صرف تفنن طبع کے لئے ہے یا پھر کسی افسانے، ناول، ڈرامے یا تحقیق میں رنگ بھرنے کے لئے ہوتا ہے۔

میرے ملک میں لکھنے والوں کی ایک ایسی ہی نسل پیدا ہو گئی ہے جو یوں تو بہت محدود ہے لیکن یہ نسل ان لوگوں کو بہت بھاتی ہے جن کا ایجنڈا اور مقصد صرف ایک ہے کہ دنیا میں مشرق سے لے کر مغرب تک بظاہر ایک ہی طرح کا کلچر پروان چڑھے جسے وہ عرف عام میں لائف سٹائل کہتے ہیں۔ اگر دنیا میں ہر ملک کے شہروں میں بسنے والے افراد ایک طرح کا پیزا، برگر اور چکن نہیں کھائیں گے، ایک طرح کی جینز، شرٹ اور کوٹ نہیں پہنیں گے، شیمپو، صابن، ٹوتھ پیسٹ استعمال نہیں کریں گے تو ان کارپوریٹ کمپنیوں کا مال نہیں بکے گا۔ ایسا سب کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو ایک طرح کا ادب بھی تخلیق کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا ادب جس کے تلازمے، استعارے اور صنف کی ساخت تک مغرب سے درآمد کی گئی ہو، لیکن اس میں کہانی کسی پسماندہ بستی کی سنائی جائے۔ یہ سب بھی قاری کو حیرت کے جہان میں لے جانے کے لئے کیا جاتا ہے جس نے اس ناول یا افسانے کو پڑھنا ہے ان کے نزدیک، غربت، بھوک، بیماری، اوپلے، میلے دانت، پھٹے پاؤں، سب ایک انوکھے ماحول کی چیزیں ہیں۔ ایسا ادب ایک خاص مقصد اور خاص تصور کے ساتھ تخلیق کیا جاتا ہے افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور کہانیوں میں مخصوص تصور سے کردار تخلیق کئے جاتے ہیں جس کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہو اسے منفی طور پر پیش کیا جائے، جیسے گزشتہ دو سو سالوں میں جب سے انگریز یہاں آیا، فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی،

ایسے ہزاروں ادیب وجود میں آئے جو یہاں کے صدیوں سے قابل احترام کرداروں کو منفی انداز میں پیش کرتے رہے اور کیا خوبصورت دعویٰ کرتے تھے کہ ہم تو حقیقت نگاری کرتے ہیں۔ایک مولوی شیطان ہے اور ایک طوائف فرشتہ۔کیا زمینی حقائق ہیں؟

پہلے یہ حقیقت نگاریاں علاقائی زبانوں میں ہوتی تھیں، لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔اب مال خریدنے کے لئے ایک ایسی کلاس وجود میں آ گئی ہے جو رہتی تو اپنے اپنے ملکوں میں ہے لیکن زندگی یعنی لائف سٹائل عالمی یعنی انٹرنیشنل رکھتی ہے۔ ویسا ہی کھانا پینا، اوڑھنا، بچھونا اور اب تو ذریعہ تعلیم اور زبان بھی ویسی ہی ہوگئی ہے، ادب باقی رہ گیا تھا اب وہ بھی عالمی زبان کا اسیر ہو گیا۔اب لاہور کے بارے میں جاننا ہو تو استاد دامن پڑھنے کی بجائے ورلڈ یارڈ کپلنگ کی روایت تھامے کوئی لاہور میں پیدا ہونے والا پنجابی پڑھو جو انگریزی میں لکھتے لکھتے زیادہ معتبر ہو چکا ہے۔ یہ عام آدمی کے لئے نہیں بلکہ ان چند ہزار لوگوں کے لئے ہے جو اس طرح کے فیسٹیول کو آباد کرتے ہیں، وہ ان کے لئے لکھتا ہے۔

جان پرکنز نے جب اپنی مشہور کتاب Confession of an Economic Hitman لکھی تو دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔پچیس سال تک اس کتاب کو کسی پبلشر نے چھاپنے کی جرأت تک نہ کی۔اس لئے کہ اس نے مجبور اور چھوٹی معیشتوں کو تباہ و برباد کرنے کی سودی بینکاری اور عالمی قرضوں کے نظام سے پردہ اٹھایا تھا۔وہ کہتا ہے کہ جہاں ہم بڑے بڑے سودی مالیاتی ادارے وسائل سے مالا مال ملکوں کو بڑے بڑے تعمیراتی منصوبوں جیسے موٹروے، ائرپورٹ، میٹرو، ڈیم وغیرہ کے لئے قرضے دے کر ان کی معیشتیں اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں، وہیں ہم ان معاشروں کے محدود طبقے کو پرتعیش زندگی گزارنے کے لئے وسائل بھی مہیا کرتے ہیں جو ان وسائل سے ہمارا ہی مال بالآخر خریدتے ہیں۔وہ کہتا ہے جب میں افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں معاشی قرضوں کیلئے حکومتوں سے مذاکرات کرتا تھا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ جن ملکوں کا ہم نے قرضوں سے خون نچوڑ رکھا ہے، جہاں غربت، افلاس، بھوک، بیماری اور جہالت گردش کر رہی ہے وہاں شہروں میں عالمی ریستورانوں، اور عالمی برانڈ کی دکانوں میں بھی بے تحاشہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ان سب کے خریدار ان کمپنیوں کے وہ اعلیٰ عہدیدار ہوتے تھے جو وہاں کے وسائل لوٹنے کے لئے قائم ہوتیں یا پھر ان این جی اوز کے اہلکار جنہیں دنیا بھر کی حکومتیں سرمایہ فراہم کرتی ہیں۔ ان دونوں طبقات کے لئے علیحدہ سکول، علیحدہ ہسپتال، علیحدہ کلب کھولے جاتے ہیں، یہ علیحدہ قسم کے شاپنگ مالوں میں خریداری کرتے ہیں اور ان کے ادب اور موسیقی کے لئے بھی علیحدہ فیسٹیول منعقد ہوتے ہیں۔یہ فیسٹیول ایک عالمی کارپوریٹ معاشرے کی تصویر ہوتے ہیں لیکن ان میں علاقائی زبانوں، موسیقی اور ادب کو بھی نمائندگی دی جاتی ہے، جیسے کسی عجائب گھر کی گیلریوں میں ایک گیلری علاقائی ثقافت کیلئے مخصوص کر دی جائے۔

لاہور کے لٹریری فیسٹیول کی کہانی بھی ایسی ہی ہے۔اس سارے انگریزی ماحول میں اُردو اور دیگر زبانوں کا حال اس پنجرے کے بندر کی طرح تھا جو ان کی ڈگڈگی پر ناچتا ہو۔کیا دیر، سوات، اٹک اوکاڑہ، دادو، شکارپور، خضدار اور سبی میں ایسا ہی ادب تخلیق ہو رہا ہے؟ ہزاروں لکھنے والے اپنی انتہائی شاندار کاوشیں جو ان کے دکھوں سے بھرپور اور ان کی زندگی سے عبارت ہوتی ہیں، لے کر منوں مٹی تلے سو جاتے ہیں۔گزر گیا وہ زمانہ جب پاک ٹی ہاؤس میں مفلوک الحال ادیب بھی عزت سے اپنی تصنیف ملک کے عظیم ادیبوں کو سنا سکتا تھا۔جب ساری زندگی ساہیوال میں گزارنے والا مجید امجد پاکستان کے ہر بڑے ادبی رسالے میں فخر کے ساتھ چھاپا جاتا تھا۔ایسا ادب آج بھی تخلیق ہو رہا ہے لیکن پاکستان کے اس ادب کی سودی معیشت سے جنم لینے والے کارپوریٹ کلچر کے اس لٹریری فیسٹیول کو ضرورت نہیں۔ ایسے لکھنے والے، دھرتی، دکھ اور بیماری کی بات کرتے ہیں اور وہ بھی اپنی زبان اور لہجے ہیں لیکن ان کے تو مقاصد ہی اور ہیں۔ کارپوریٹ کلچر کو ایک مرنجاں مرنج ماحول اور ایسا ادب چاہیے ہوتا ہے جو عالمی زبان اور تہذیب کی اخلاقیات کا درس دیتا ہو۔کیا کوئی ادارہ پیرس شہر میں انگریزی زبان میں لٹریری فیسٹیول منعقد کرنے کی فضول خرچی کر سکتا ہے یا پھر لندن شہر میں فرانسیسی زبان میں لٹریری فیسٹیول سجانے کی......؟ یہ صرف مجبور معیشتوں اور سودی عالمی بینکاری سے جنم لینے والے مقروض معاشروں میں ہوتا ہے۔جس قوم کو تباہ کرنا ہو، سب سے پہلے اس کی زبان اس سے چھینی جاتی ہے، پھر اسے جدھر چاہے مرضی ہانک دو، وہ شکایت تک نہیں کرتی۔

☆......☆......☆